

محمد علی

از
خواجہ احمد عباس

ناشران
صحافی پبلشنگ ہاؤس
کتاب گھر دہلی

”مادرِ ہند پوت سیریز“ (رجسٹرڈ نمبر)

مختصر سوانح حیات

شہیدیت رئیس الاحرار مولانا محمد علی موم

خواجہ احمد عباس

ناشران

حالی پبلشنگ ہاؤس ”کتاب گھر“

قیمت ۴

دہلی

(کتبہ چوکلا)

(مطبوعہ پچیسویں صدی)

پیشکش

اپنے والد کے نام

کہ انہوں نے نہ صرف مجھے مولیٰ لینا
مجھ غسلی مرحوم کی ذات سے بلکہ ان کی
صفات سے بھی روشناس کرایا۔

احمد عباس

بہینی
{ ۲۲ مارچ ۱۹۳۶ء

M.A. LIBRARY, A.M.U.



U6231

پاچہ

دنیا کی جتنی زندہ قومیں ہیں ان میں قومی رہنماؤں اور ملک کے خادموں کی یاد
مختلف طریقوں سے تازہ رکھی جاتی ہے، اُن کے مجسمے نصب کئے جاتے ہیں، اُن کے ناموں
سے منسوب ادارے قائم کئے جاتے ہیں، اُن کی پیدائش یا موت کے دنوں کو سالانہ منایا
جاتا ہے، اُن کی سوانح عمریاں شائع کی جاتی ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آخر الذکر
طریقہ ہی سب سے بہتر ہے کیونکہ اپنے قومی بزرگوں کی زندگی کے حالات، اُن کے کارناموں
اور قربانیوں سے عوام کو روشناس کرانا نہ صرف اُن کی یاد کو تازہ کرنا ہے بلکہ اپنے
ملک کی ایک بڑی خدمت ہے۔ دنیا کے ہر بڑے انسان کی زندگی اپنے اندر ہمارے
لئے زبردست سبق رکھتی ہے اور اس کا تذکرہ ضروری ہے تاکہ وہ ہمارے نوجوانوں
کے لئے ایک مشعل کا کام دے اور اُن کو بھی اپنے ملک اور قوم کی خدمت کی ترغیب دے
تعلیم کی کمی کی وجہ سے ہندوستان کی ایک بدقسمتی یہ بھی ہے کہ ہمارے عوام اپنے
ملک کی بڑی ہستیوں سے بالکل ناواقف ہیں۔ مگر اس سے زیادہ افسوسناک واقعہ یہ ہے
کہ اکثر تعلیم یافتہ ہندوستانی بھی اپنے قومی رہنماؤں کے حالات زندگی سے بے خبر ہیں۔
اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اب تک عوام کے لئے ایسی کتابیں موجود نہیں ہیں جو
آسان زبان اور عام فہم انداز میں ہمارے سیاسی لیڈروں، مصلحوں، عالموں، شاعروں
ادیبوں اور دوسرے زبردست ہندوستانیوں کی سوانح حیات پیش کریں۔ اس کی
کودور کرنے کے لئے حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی نے چھوٹی چھوٹی کتابوں کا

ایک سلسلہ "اور ہند کے سپوت" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس سلسلہ میں بلا کسی تفریق کے ہندوستان کی تمام بڑی ہستیوں کے حالات زندگی شائع کئے جائیں گے۔

مولانا محمد علی جلی یہ مختصر سوانح حیات اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ ہندوستانیوں اور ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تشکیل میں مولانا مرحوم نے جو نمایاں حصہ لیا وہ محتاج بیان نہیں، اُن کا عزم، اُن کا استقلال، اُن کی وطن پرستی اور قوم پروری یہ سب وہ صفات ہیں جو ہمارے نوجوانوں کے لئے ہدایت اور نمونہ ثابت ہو سکتی ہیں، اُن کی تمام زندگی قوم کی خدمت میں گزری، ہندوستان سے اُن کی محبت کبھی کم نہ ہوئی اور انچھروم تک وہ اُس کی آزادی کے لئے کوشاں رہے۔ کاش ہمارے اہل ملک اُن کی زندگی کو ایک روشن مثال کی طرح پیش نظر رکھیں۔

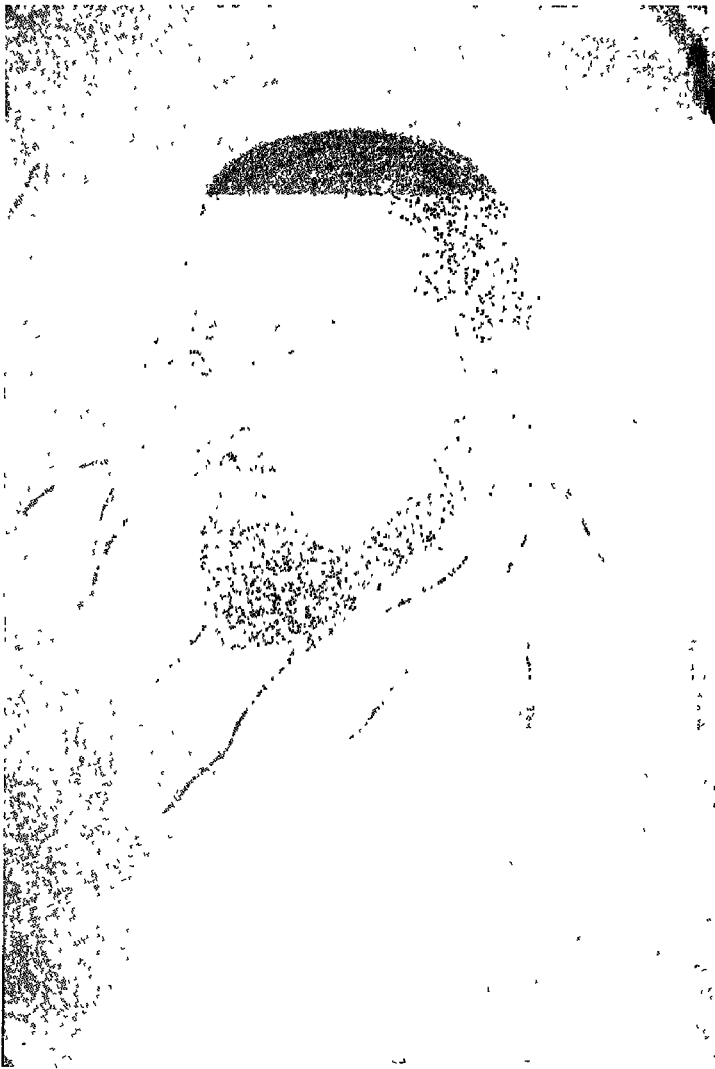
اسی سلسلہ میں جلد شائع ہونے والی کتابیں سر سید احمد خاں اور مہاتما گاندھی پر ہوں گی، اور ہمیں امید ہے کہ یہ قومی سلسلہ ملک میں مقبول ہوگا۔

اس کے علاوہ مشاہیر عالم سیریز کا انتظام بھی ہو رہا ہے جس میں سب سے پہلی کتاب منوبہنی کی زندگی کے حالات ہے، حبشہ اور اٹلی کی جنگ کی روشنی میں لکھی گئی شائع ہو گئی ہے۔

ناشران

حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی

اپریل ۱۹۳۶ء



مولانا محمد علی

”میں آج میں مقصد کے لئے یہاں آیا ہوں وہ یہی ہے

کہ میں اپنے ملک کو واپس جاؤں تو آزادی کا منشور میرے

ہاتھ میں ہو۔ میں غلام ملک میں لوٹ کر نہیں جاؤں گا

مجھے ایک غیر ملک میں جیسے آزادی کا شرف حاصل ہے

غربت کی موت منظور ہے۔ اگر آپ مجھے ہندوستان

کی آزادی نہیں دیں گے تو پھر یہاں میرے لئے ایک

قبر کی جگہ دینی پڑے گی۔“

..... گول ہنز کا نفرنس میں مولانا محمد علی کی تقریر

محمد علی

پیدائش اور محمد علی ۱۷۷۰ء کے آخر میں پیدا ہوئے، ان کے والد عبدالعلی خان صاحب بھڑکے رئیس تھے، اور نواب یوسف علی خان فرمائروائے رامپور کے دربار میں ایک ممتاز منصب پر فائز تھے۔ اکثر مشاہیر عالم کی طرح محمد علی کے سر سے بچپن ہی میں باپ کا سایہ اٹھ گیا۔ اور ان کی اور ان کے دو بڑے بھائیوں شوکت علی اور ذوالفقار علی کی تعلیم اور تربیت کی پوری ذمہ داری ”بی اماں“ مرحومہ کو اٹھانی پڑی۔ کلام مجید اور اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم کے بعد تینوں بھائی بریلی کے ہائی اسکول میں داخل کر دئے گئے اور یہاں اس کم سنی میں محمد علی کی جودت، ذہانت، اور حاضر جوابی کا سکہ بیٹھ گیا۔ وہ کچھ ایسے محنتی نہیں تھے، اور درسی کتابوں کی طرف کم توجہ کرتے تھے، مگر سب استادان سے خوش رہتے تھے اور طالب علم انہیں عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ قیادت کی صلاحیت محمد علی میں ابھی سے موجود تھی، اور سکول میں وہ اپنے ہم عمروں کے مالے ہوئے لیڈر تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب علی گڑھ کا کچ نیا قائم ہوا تھا۔ سرسید علی گڑھ کی مخالفت کا زور کم ہوتا جاتا تھا۔ اور اکثر شرفا اپنے بچوں کو تعلیم کی غرض سے علی گڑھ بھیج رہے تھے۔ مغربی تعلیم نے ابھی تک مسلمانوں میں رواج نہیں پایا تھا اور اسی لئے سرکاری ملازمتوں اور اعلیٰ عہدوں پر بہت کم مسلمان نظر آتے تھے۔ سرسید کی کوششوں سے چند گھرانوں میں تعلیم کا چرچا

کچھ کچھ ہو چلا تھا کیونکہ بغیر کالج کی ڈگری کے سرکاری ملازمتوں کا دروازہ ان کیلئے بند تھا۔ علی گڑھ میں زیادہ تر طالب علم کھاتے پیتے گھرانوں کے تھے۔ معاش کی طرف سے اطمینان تھا کہ بی۔ اے کرے ہی ڈپٹی کلکٹری یا اس قسم کا کوئی اور عہدہ مل ہی جائے گا۔ بورڈنگ ہاؤس کی زندگی بے فکری کی تھی۔ کھیلوں میں علی گڑھ والوں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، انگریزی تحریر اور تقریر میں انہیں کمال حاصل تھا۔ مغربی تہذیب و تمدن سے پہلے پہل سابقہ پڑا تھا اس لئے طلبہ اچھا اور بڑا دونوں قسم کا اثر بہت تیزی سے قبول کر رہے تھے۔

یہ فضا تھی جس میں شوکت علی اور محمد علی داخل ہوئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں علی گڑھ پر چھا گئے۔ ریکٹ سے دونوں بھائیوں کو شوق تھا۔ لیکن شوکت علی نے اس کھیل میں زیادہ ترقی کی۔ یہاں تک کہ کپتان مقرر ہو گئے۔ ادھر محمد علی نے یونین میں تیغ زباں کے جوہر دکھائے اور فصاحت و بلاغت میں جہند گار دیے۔ سال کا بڑا حصہ محمد علی کھیل کود اور تفریبات میں گزارتے تھے۔ لیکن ان کا حافظہ اور ذہن اس بلا کا تھا کہ امتحان سے دو مہینے پہلے محنت شروع کر کے ہمیشہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہو جاتے تھے۔ انگریزی میں محمد علی کی قابلیت قابل رشک تھی۔ تقریر اور تحریر دونوں پر قادر تھے یونین میں ان کی انگریزی تقریریں سن کر اکثر انگریز پروفیسر دنگ رہ جاتے تھے مگر اس آزادی رائے کے باعث جو ہمیشہ محمد علی کا طرہ امتیاز رہی، ان سے اکثر اساتذہ سے اختلاف ہوا۔ وہ ابتدائی سے پرجوش اور

ولیرانہ تقریبیں کرنے میں مشہور تھے۔

غرض ۱۹۶۷ء میں بیس سال کی عمر میں محمد علی نے بی۔ اے۔ کا امتحان دیا۔ انہیں اپنے پاس ہونے کی امید ضرور تھی اور جو لوگ محمد علی سے واقف تھے وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہونگے۔ مگر جب نتیجہ نکلا تو سب یہ دیکھ کر حیرت میں رہ گئے کہ علی گڑھ کا یہ کھلنڈڑا جس نے وقت کا بیشتر حصہ یونین کے پلیٹ فارم اور کرکٹ کے میدان پر گزارا تھا تمام صوفیہ کے کامیاب طلباء میں اوّل رہا۔

اس کے بعد علی گڑھ کی زندگی ختم کرنے کے بعد محمد علی عازم انگلستان ہوئے۔ اس کے دوستوں نے افسوس کے ساتھ اپنے رفیق اور سردار کو خست کیا اور محمد علیؒ کیلئے سول سروس کی تمنا میں ولایت روانہ ہو گئے۔ وہ لیکن کالج آکسفورڈ میں داخل ہوئے اور سول سروس کے امتحان کی تیاری کرنے لگے۔ لیکن قدرت کو یہ منظور نہیں تھا کہ وہ اس طوق غلامی کو اپنی گردن میں لٹکائیں۔ اہل میں محمد علی کی علم دوست اور ادب آشنا طبیعت کو اس سے کوئی مناسبت ہی نہیں تھی۔ قیام آکسفورڈ کے زمانے میں انہوں نے صرف موافق طبع مضامین کا مطالعہ کیا اور دوسرے مضامین کی طرف توجہ ہی نہیں کی۔ نتیجہ ملا ہر سہے جو ہوا ہوگا۔ شوکت علی نے جس وقت ہندوستان میں مجبوتے بھائی کی ناکامی کی خبر پڑھی تو انہیں سخت رنج ہوا۔ اور محمد علی ولایت سے واپس بلا لئے گئے۔ مگر بی ایماں کا حوصلہ دیکھئے کہ انہوں نے اس ناکامی کا کوئی اثر اپنے اوپر ظاہر نہ ہونے دیا۔ بلکہ جب محمد علی آئے تو ان

کی دلدہی اور بہت افزائی کی۔ اسی سال محمد علی کی شادی ہو گئی اور وہ دوبارہ ولایت بھیجے گئے کہ انگریزی ادب میں بی۔ اے کریں۔ چونکہ ادب کے طبیعت کو شروع ہی سے لگاؤ تھا اس لئے انہوں نے نہایت کامیابی کے ساتھ آنرز کی ڈگری حاصل کی اور ہندوستان واپس چلے آئے۔ قیام ولایت میں محمد علی نے دوستوں کا ایک وسیع حلقہ پیدا کر لیا۔ انہوں نے بہترین صحبتوں میں شرکت کی۔ سیر و تفریح، کھیل کود کا لطف اٹھایا، مگر باوجود ہزار ہا تحریصوں کے نہایت پاکبازانہ زندگی بسر کی۔

رام پور اور بڑودہ | ولایت سے واپسی پر نواب صاحب رام پور نے انہیں رام پور ہائی سکول کا پرنسپل اور ریاست کا انسر تعلیمات بنادیا۔ لیکن ریاست کی فضا میں جو سازشیں سے پرستی محمد علی کا نبضاً مشکل تھا۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے نوکری سے استعفیٰ دیدیا۔ اور شوکت صاحب کے پاس چلے گئے۔ مگر انہیں زیادہ عرصہ تک بے کار نہ رہنا پڑا۔ قیام ولایت کے دوران میں ان کے تعلقات بڑودہ کے ولیعہد کنور فتح سنگھ سے قائم ہو چکے تھے۔ اور کنور صاحب کی کوشش سے محمد علی ریاست بڑودہ میں بلائے گئے۔ چار سال تک انہوں نے محکمہ ایفون میں ایک اعلیٰ افسر کے فرائض انجام دیے اور اتنی مستعدی اور قابلیت سے کام کیا کہ ملازمت کے پانچویں سال ریاست کے ضلع نوساری کے کمشنر مقرر کئے گئے۔ اس عہدے کے فرائض بھی محمد علی نے نہایت خوبی اور دیانت داری سے انجام دیے۔ انہوں نے متعدد اصلاحات نافذ کیں

خصوصاً غریبوں پر جو ظلم ہوتا تھا اس کی ردک مقام کی اور چند ہی سال میں رعایا کے دلوں میں گھر کر لیا۔ کچھ عرصے کو در فتح سنگھ کے پرنسپل اسٹنٹ بھی رہے مگر کنور صاحب تھوڑے ہی دنوں بعد شراب کی بھینٹ چڑھ گئے۔

نو کری سے استعفیٰ | محمد علی کے ادبی ذوق نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا محکمہ اینڈن کی افسری یا ضلع کی حکومت کے کام

کے باوجود انہوں نے اپنا تحریری مشغلہ جاری رکھا۔ بڑودہ کی ملازمت سے پہلے الہ آباد سے ”گپ“ کے نام سے انگریزی میں ایک مہاجرہ پرچہ اپنے آپ کو فورڈ کے رفیق کنور جگدیش پرشاد (حال وزیر تعلیم حکومت ہند) کی شرکت میں نکالا تھا مگر دو پرچوں کے بعد کوئی نمبر نہ نکل سکا۔ ملازمت کے دوران میں بھی مضمون نگاری جاری تھی۔ ”ائمز آف انڈیا“ میں اکثر لکھتے رہتے تھے۔ اسی عرصہ میں ان کے چند مضامین مسلمانوں کے حقوق کی حمایت میں شائع ہوئے۔ ریاست کی کونسل سے جواب طلب ہوا محمد علی نے ایسا دندان شکن جواب دیا کہ کونسل سے سوائے اس کے کچھ بن نہ پڑی کہ ایک خفیہ سرکاری سرکلر کے ذریعہ ریاست کے ملازموں کو اخباروں میں سیاسی مضامین لکھنے کی ممانعت کر دے۔ محمد علی کا دل ملازمت سے کھٹا ہو گیا۔ انہوں نے پہلے حضرت لی اور پھر باوجود ہماراجہ کے اصرار کے استعفیٰ دیکر الگ ہو گئے۔

کامریڈ | اب محمد علی کو موقع ملا کہ اپنی صحافتی قابلیت کے جوہر دکھائیں کلکتہ سے ایک انگریزی ہفتہ وار اخبار ”کامریڈ“ (یعنی رفیق) نکالا

جو سال بھر ہی میں اتنا مستبول ہوا کہ اس کے خریداروں میں ملک کے تمام سربر آوردہ لوگ یہاں تک کہ لیڈی ہارڈنگ اور لارڈ ہارڈنگ بھی شامل تھے۔ محمد علی انگریزی اہل زبان کی طرح لکھتے تھے اور ان کا اسلوبِ بیاں اتنا شمسۃ اوپاکیزہ ہوتا تھا کہ بڑے بڑے انگریزان کی قابلیت کے قائل تھے۔ سلاستِ بیاں کے ساتھ قدرت نے بذلہ سخی اور شگفتگی کا جو ہر بھی عطا کیا تھا۔ اس لئے ہر مضمون کو اتنا دلچسپ بنا دیتے تھے کہ ایک دفعہ شروع کرنے کے بعد بے ختم کئے نہیں چھوڑا جاتا تھا۔ یہ پرچہ ایک مدت تک بڑے اہتمام اور شان سے نکلتا رہا اور تمام ملک میں اس سرے سے اس سرے تک پھیل گیا۔ آخر پریس ایکٹ کے ماتحت بند ہو گیا۔

ملک کی سیاست میں شریک ہونے کے بعد اکثر محمد علی کو اتنا موقع نہیں ملتا تھا کہ اخبار کی جتنی خدمت کرنی چاہتے کر سکیں۔ مگر ان کو نائب بھی راجہ غلام حسین جیسا ملا تھا۔ جس کی انگریزی کی قابلیت اور صحافت کے خود محمد علی قائل تھے۔ یہ اس نوجوان ہی کا کام تھا کہ محمد علی کی غیر موجودگی میں ”کامریڈ“ اسی شان سے نکالتا تھا۔ اور کسی کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ محمد علی کا قلم ہے یا راجہ غلام حسین کا۔ ”کامریڈ“ کے مستقل مضمون نگاروں میں سید ولایت علی ”بمبوق“ بھی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ مگر محمد علی کو بھی اپنے فرائض کا اس قدر خیال رہتا تھا کہ کسی جلسہ وغیرہ کی شرکت کے لئے باہر جانا ہوا اور اخبار کی اشاعت کی تاریخ سر پر

آگئی تو جہاں ہوئے رات کی نیند حرام کر کے مضمون لکھ کر بھیجا۔ بلکہ کام کانگریس کے (سلسلہ) موقع پر تولی کا کم کا ایک پورا افتتاحیہ تارے بھیجا۔

مسلم لیگ | مسلم لیگ سلسلہ ۱۹۰۶ء میں بھام ڈھاکہ قائم ہوئی محمد علی نے اس وقت تک سیاسی دنیا میں کوئی نمایاں

حصہ نہیں لیا تھا۔ لیکن باوجود سیاسی نا تجربہ کاری اور نو عمری کے لیگ کے نظام کی ترتیب اور قواعد و ضوابط کی درستی کا کام اسی نوجوان اخبار نویس نے کیا۔ لیگ اولاً اعتدال پسندوں کی ایک جماعت تھی جس کا کام بس اتنا تھا کہ سال میں ایک دفعہ جلسہ کر کے چند ریزولوشن پاس کر دے جن میں گورنمنٹ اور برادران وطن دونوں سے شکایت ہو کہ مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جاتا اور نشستوں اور ملازمتوں کے لئے سرکار دولت مدار سے مؤدبانہ درخواست کی جائے۔ یہ محمد علی ہی کا کام تھا کہ انہوں نے لیگ کے مژدہ قالب میں جان ڈالی اور آخر کار اعلان کر دیا کہ لیگ ہندوستان کی آزادی کے لئے جدوجہد کرے گی۔ اگرچہ اب مسلم لیگ ”وفا شعاروں“ کی مدد سے پھر اپنے اصلی رنگ پر آگئی ہے، مگر محمد علی کی قیادت میں اس نے ملک کی نہایت شاندار اور قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔

طی وفد | سلسلہ ۱۹۱۳ء میں جب جنگِ بلقان شروع ہوئی تھی تو ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک سخت ہیجان پیدا ہوا۔ گورنمنٹ کے

مسلمان ملازمین اور موافقین نے بھی کھلم کھلا ترکوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار شروع کر دیا۔ ملک میں اُدھر سے اُدھر تک ایک آگ لگی ہوئی تھی یہاں تک کہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے بھی ایک پر جوش ولولہ انگیز نظم لکھی جو لکھنؤ کے ایک جلسہ میں پڑھی گئی۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر انصاری نے یہ تجویز کی کہ ہندوستان سے ایک طبی وفد ترک مجروحین کی مدد کیلئے جائے۔ لیکن وقت سرائے کی تھی جس کی فراہمی کا بیڑا محمد علی نے اٹھایا۔ اسی عرصے میں سب بڑے شہروں میں ترکوں کی مدد کے لئے ”ہلال احمر“ کے نام سے انجمنیں قائم ہو گئی تھیں۔ ان انجمنوں کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں سے چندہ جمع کر کے ترکوں کو مالی امداد بھجوائیں۔ محمد علی نے طبی وفد کی تجویز دہلی کی انجمن ہلال احمر کے سامنے پیش کی اور مسئلہ کی اہمیت کو سمجھایا۔ انجمن کے اراکین نے اس وقت پندرہ ہزار روپیہ دینے کا وعدہ کر لیا مگر کچھ عرصہ کے بعد سرائے بدل دی اور وفد کو مالی امداد دینے سے انکار کر دیا۔ محمد علی نے یہ سن کر بھی ہمت نہ ہاری بلکہ ڈاکٹر انصاری سے کہا کہ روپیہ کی طرف سے مطمئن ہو کر باقی انتظام مکمل کریں۔ اسی رات کو جا کر کامریڈ کے لئے ایک ایسا معرکہ الٹا مضمون لکھا کہ اس کی اشاعت کے دوسرے ہی دن سے روپیہ کی باریش شروع ہو گئی۔ اس واقعے سے محمد علی کے قلم کی قوت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ چند ہی دن میں ضرورت سے زیادہ روپیہ فراہم ہو گیا۔ اور وفد ترک بھیجا گیا۔ جہاں اراکین وفد نے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ کامریڈ سے ضمانت ترکوں کی مالی مصیبتوں کو دیکھ کر محمد علی نے

تمام ہندوستان کا دورہ کیا، اور لیہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے ترکی حکومت کے تسکات خرید کر لاکھوں روپے سے ترکوں کی مدد کی۔ اسی زمانے میں ترکوں نے اہل مقدونیہ کے نام ایک دروانگیر اپیل شائع کی تھی جس کا عنوان تھا "مقدونیہ والو! اور ہماری مدد کرو" محمد علی نے کمال جرأت سے کام لے کر پوری اپیل قسط وار کامریڈ میں شائع کی۔ ہسکا شائع ہونے پر ہی تھا کہ گورنمنٹ نے کامریڈ کے تمام پرچے جس میں یہ اپیل شائع ہوئی تھی ضبط کر لئے اور دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کی۔ پریس بیٹ اس زمانے میں بھی گورنمنٹ کا ایک طاقتور حربہ تھا اُن کو آزاد خیال اخباروں کے خلاف اکثر استعمال کیا جاتا تھا۔ مگر کامریڈ کا اب بھی وہی دم خم تھا۔ ۱۹۱۴ء میں جب ٹرنز مارین کمپنی نے حجاز کی جہاز رانی کے اجاڑے کی تجدید کی درخواست حکومت ہند کے سامنے پیش کی اور محمد علی کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے فوراً کامریڈ کا ایک ضمیمہ شائع کیا جس میں اس درخواست کے خلاف سختی سے صدائے احتجاج بلند کی۔ اس ضمیمہ کا یہ نتیجہ ہوا کہ لارڈ ہارڈنگ نے درخواست کو مسترد کر دیا۔ اگرچہ چند سال بعد جب محمد علی نظر بندی میں تھے پھر اسی کمپنی کو ٹھیکہ دے دیا گیا۔

”ہمدرد“ | اب تک محمد علی کی صحافت انگریزی تک محدود تھی مگر جب دارالسلطنت کی تبدیلی کے ساتھ کامریڈ بھی کلکتہ سے

دہلی آیا تو حکیم اجمل خان صاحب مرحوم کے مشورے سے محمد علی نے ایک اردو روزنامہ ”ہمدرد“ کے نام سے جاری کیا۔ ہمدرد کے ادارے

میں انہوں نے چُن چُن کر وہ ادیب اور مضمون نگار رکھے جن میں سے ہر ایک ملک کے اہل قلم میں ممتاز درجہ رکھتا تھا۔ میر محفوظ علی، سید ہاشمی فریدیادی قاضی عبدالغفار صاحب، مولوی عبدالکلیم شرر، اور ڈاکٹر سعید احمد بریلوی جیسے معاون ملے تو ہمدرد بھی آسمانِ صحافت پر اس شان سے چمکا کہ ادیب اُردو اخبار کے سامنے ماند پڑ گئے۔ خبروں کی دیدہ زیب ترتیب، اعلیٰ مضامین، اقتراحہ، علمی مقالے اور تفریحی مضامین یہ سب ہمدرد کی وہ خصوصیات تھیں جو آج تک کم از کم کسی اُردو اخبار کو توصیف نہیں ہوئیں بلکہ بعض خواباں ایسی بھی تھیں جو بہت کم انگریزی اخباروں میں نظر آئیں گی۔ عام طور سے ہندوستان سے جو انگریزی یا اُردو روزنامے نکلے ہیں ان میں ایڈیٹر اپنے آپ کو ادارت کے دوسرے ارکان سے بالاتر سمجھتا ہے اور اپنا فرض فقط احکام صادر کرنا جانتا ہے۔ برخلاف اس کے محمد علی کا ادارہ ایک خاندان کی طرح تھا اور ایک وقت معین پر تمام لوگ محمد علی کے کمرے میں اکٹھے ہو کر اگلے دن کے نمبر کے متعلق مشورہ کرتے تھے۔ محمد علی ہر ایک کو اس کے کام کے متعلق دیا دیتے تھے اور دوسروں کو بھی موقع دیتے تھے کہ اخبار کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کریں۔ یہی وجہ تھی کہ ”ہمدرد“ اور ”کامریڈ“ کے ادارے کے لوگ اپنا کام محنت، دلچسپی اور خلوص کے ساتھ کرتے تھے۔ اور یہی ان اخباروں کی کامیابی کا راز تھا۔

غرض ”ہمدرد“ نہایت شان کے ساتھ نکلتا رہا۔ یہاں تک کہ محمد علی

کی نظر بندی کے بعد اس کی اشاعت ملتوی کرنی پڑی۔ بیجا پور جیل سے رہائی کے بعد کامریڈ اڈر ہمدرد پھر نکلے۔ مگر افسوس ہے کہ اس بار وہ پہلی ہی شان نہ تھی۔ ایک تو راجہ غلام حسین کی ناگہانی موت نے کامریڈ کے کام کو بہت نقصان پہنچایا۔ دوسرے اب محمد علی سیاست کے اکھاڑے میں اتر چکے تھے۔ ان کا تمام تروت و قوت قومی اور ملکی کالوں میں صرف ہوتا تھا۔ کانگریس کی رہنمائی، خلافت کی ناخداہی، اور دوسری سیاسی مصروفیتیں اخباروں کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہ دیتی تھیں۔

ایک معرکہ الارامضمون | کامریڈ کی ضمانت کی ضبطی جو اس کی بے وقت موت کا سبب بنی، ایک ایسے

مضمون کے سلسلہ میں ہوئی جو ہندوستان کی تاریخ صحافت میں یادگار رہیگا۔ جنگ عظیم کے آغاز پر لندن کے مشہور اخبار "ٹائمز" نے ایک افتتاحیہ میں ترکوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ برطانیہ کا ساتھ دیں۔ اس مضمون کو دیکھ کر محمد علی نے وہ معرکہ کا جواب لکھا کہ لندن "ٹائمز" کے مضمون کے چیمبرے اڑا دیے مضمون کا عنوان تھا "ترکوں کا فیصلہ" (Choice of the Turks) اور یہ کامریڈ کے بائیس کالم پر پھیلا ہوا تھا۔ باوجود اپنی بیگم صاحبہ کی علالت کے محمد علی نے چالیس گھنٹے کی مسلسل نشست میں یہ مضمون تیار کیا۔ جب خود لکھتے لکھتے تھک جاتے تو اسسٹنٹ ایڈیٹر کو لکھواتے جاتے تھے۔ مضمون کیا تھا ممالک اسلامی میں برطانوی

استبداد کی ریشہ دو اینیوں کی مکمل داستان تھی حکومت بھلا کب گوارا کر سکتی تھی کہ ایسے مضمون کا لکھنے والا چین سے بیٹھے۔ چند ہی روز میں ہمسدر اور کامریڈ دونوں کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔ محمد علی نے اپیل کیا اور ہائی کورٹ میں خود بحث اور جرح کی۔ تمام عدالت وکیلوں، بیرسٹروں اور تماشائیوں سے بھری ہوئی تھی اور سر شخص ان کی ذہانت اور قانونی قابلیت کو دیکھ کر حیرت کرتا تھا۔ مگر نتیجہ جو ہونا تھا ہوا۔ ضمانت کی ضبطی کا حکم بحال رہا۔ کامریڈ بند ہو گیا۔ مگر اس دن سے محمد علی اور سب کاموں کو چھوڑ کر سیاست ہی کے ہو رہے۔ حکومت کو معلوم ہو گیا کہ ایک زبردست حریف میدان میں اُتر رہے اور قوم نے جان لیا کہ اس کا مجاہدِ اعظم آن پہنچا ہے۔

نظر بندی | ضمانت کی ضبطی کے بعد محمد علی کی صحت بہت گر گئی اور حکیم اہل خانہ مرحوم اور ڈاکٹر انصاری دونوں نے مشورہ دیا کہ ان کو دماغی محنت سے آرام لینا چاہئے۔ تبدیل آب و ہوا کی خواہش اور وطن کی یاد انہیں رام پور لے گئی لیکن وہاں پہنچا ہی تھا کہ صوبہ کے انسپٹر جنرل پولیس نواب رام پور کے پاس آئے اور محمد علی کو حکم ملا کہ بغیر نواب صاحب کی اجازت کے وہ ریاست کی حدود نہیں چھوڑ سکتے۔ مگر ایک ہی دن کی نظر بندی کے بعد رہائی مل گئی۔ اس عرصے میں مولینا شوکت علی بھی رام پور آگئے تھے۔ دونوں بھائیوں کا ارادہ دہلی ہوتے ہوئے اجیر شریف کے سالانہ عرس میں جانے کا ہوا۔ دہلی آئے دو ہی دن ہوئے تھے کہ ضلع کے میجسٹریٹ کا حکم ملا کہ دونوں بھائی اپنے آپ کو نظر بند سمجھیں

نظر بندی کی خبر سن کر محمد علی بے حد خوش ہوئے اور انہوں نے بجائے افسوس کرنے کے خدا کا شکر ادا کیا۔ حسب الحکم ہر دلی جا کر رہے۔ یہاں ان کو ہر طرح کی آسانیاں حاصل تھیں۔ ہمدرد کے لئے مضامین لکھ سکتے تھے، دوست احباب دہلی سے ملاقات کے لئے آسکتے تھے۔ مگر حکومت کو یہ بھی گوارا نہ تھا۔ اس لئے ان کو لکھنؤ ڈون بھیج دیا گیا اور ان کے قلم کی آزادی بھی سلب کر لی گئی۔

جرم؟ محمد علی نے اپنے کبھی کے دوست سرجمیس سن گورنر صوبہ متحدہ کو خط لکھا کہ کم سے کم مجھے میرے جرم سے تو مطلع کیا جائے۔ مگر اس کا یہ جواب ملا کہ اس مسئلے پر گورنر صاحب زیادہ گفت و شنید نہیں کر سکتے گورنمنٹ سے جب مجالس مقننہ میں سوالات کئے گئے تو اس نے قانونی دفعتاً کے حوالے دیکر مائل دیا۔ مگر سائنس میں جب دہلی کی سالانہ سرکاری رپورٹ شائع ہوئی تو اس میں علی برادران کے متعلق فرمایا گیا کہ ”محمد علی شوکت علی کو نظر بند کرنا ضروری معلوم ہوا“ اس لئے کہ گورنمنٹ کے خلاف ان کی سخت و تبلیغ کا روحانیاں مسلمانوں پر بڑا اثر ڈال رہی تھیں۔ ”امپیریل کاونسل میں جناب اوپنہارم صاحب نے جب گورنمنٹ سے اس نظر بندی کی وجہ مانگیں تو جواب ملا ”چونکہ ان دونوں بھائیوں نے قلم کھلا گورنمنٹ کے خلاف تحریک میں حصہ لیا اس لئے ان کو نظر بند کرنا ضروری سمجھا گیا۔ اور اگر وہ آئندہ ایسی حرکتوں سے باز رہنے کا وعدہ کریں تو گورنمنٹ ان کی رہائی کے مسئلہ پر غور کر سکتی ہے“ مگر ایسا وعدہ کرنا معافی مانگنے کے برابر تھا اور محمد علی

جیسے غیور کے لئے معافی موت سے بدتر تھی۔

اصل وجہ ظاہر تھی۔ اس وقت تک گورنمنٹ نے سمجھ رکھا تھا کہ کم سے کم مسلمان تو ہمیشہ وفادار سرکار رہیں گے۔ مگر ان دونوں بھائیوں کی سرگرمیوں اور عام سیاسی بیداری کے اثرات سے مسلمانوں میں بھی طنز پرستی اور خودداری کا مادہ پیدا ہو چلا تھا۔ ترکوں کے خلاف تمام یورپ کی قوتوں کے اجتماع سے جس میں برطانیہ بھی شامل تھا مسلمان حکومت سے اور بھی بد دل ہو گئے تھے۔ اس پر محمد علی کے مضامین خصوصاً ”ترکوں کے فیصلہ“ نے گورنمنٹ کی طرف سے بہت کچھ بذمہ پھیلادی تھی۔ حکومت کا خیال تھا کہ اس سائے فساد کی جڑ ہی دونوں بھائی ہیں۔ اسی لئے یہ دونوں غیر متعین مدت کے لئے نظر بند کر دیے گئے۔ چونکہ ان سے کوئی خاص جرم سرزد نہیں ہوا تھا اس لئے باقاعدہ مقدمہ چلا کر قید کرنا مشکل تھا۔

غداروں سے انکار | اس سلسلے میں محمد علی کے مشیر قانونی مسٹر گھاٹے کا ایک خط قابل ذکر ہے جو انہوں نے علی بردار

کی نظر بندی کے متعلق مسٹر بمینٹ کو لکھا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی انگریز ہندوستانیوں سے اپنا کام نکالنے کے لئے ہر قسم کا لالچ دیتے تھے۔ مسٹر گھاٹے لکھتے ہیں کہ ان کو معلوم ہوا ہے کہ جب محمد علی اور سید وزیر حسن انگلستان میں تھے تو ان سے کہا گیا تھا کہ وہ ”انڈو برٹش ایسوسی ایشن“ میں شامل ہوں اور حکومت ہند کے اینگلو انڈین ارکان کے ساتھ لارڈ ہارڈنگ اور سر علی امام کے مقابلے

میں کارروائی کریں۔ یہ تحریک جن صاحب نے کی تھی وہ سرچارلس کلپلینڈ ڈائرکٹر جنرل سی۔ آئی۔ ڈی تھے۔ محمد علی نے اس سازش میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ سرچارلس ان سے سخت ناراض تھے محکمہ خفیہ پولیس یا سی۔ آئی۔ ڈی کا جو زبردست ہاتھ ہندوستان کی حکومت میں ہے وہ سب کو معلوم ہے اور اس کے افسر اعلیٰ کو ناخوش کرنے کے بعد محمد علی زیادہ عرصہ آزاد نہ رہ سکتے تھے۔

چھند واڑہ چھند واڑہ وسط ہند میں ایک چھوٹا سا مقام ہے۔ اپنے وطن سے دور اس جگہ نظر بند ہو کر بھی محمد علی بیکار نہ بیٹھے دونوں بھائیوں نے ایام اسیری کی فرصت کو غنیمت جان کر تاریخ عالم اور مذہب اسلام کا گہرا مطالعہ کیا۔ محمد علی نے کئی معرکے کی قومی نظمیں تصنیف کیں۔ اس عرصے میں ان کی رہائی کی کوششیں برابر جاری رہیں لیکن گورنمنٹ جنگ کی وجہ سے اور بھی خائف تھی۔ اس لئے کسی طرح ان کو آزادی دینے پر تیار نہ تھی۔

مسلم لیگ کی صدارت ستمبر ۱۹۱۶ء میں ہندوستان کے مسلمانوں نے محمد علی کو اپنی واحد سیاسی انجمن مسلم لیگ کا صدر منتخب کر کے ان کی غیر معمولی سیاسی خدمات اور قربانیوں کا اعتراف کیا لیکن گورنمنٹ نے انہیں جلسے میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دی۔ ان کے بجائے ان کی والدہ بی اماں مرحومہ نے شرکت کی اور کرسی صدارت پر محمد علی کی تصویر رکھ دی گئی۔

اسی سال کانگریس کے سالانہ اجلاس میں ہندوستان کے مشہور قوم پرست، بال گنگا دھر تلک نے ایک ریزولوشن پاس کرایا جس میں گورنمنٹ سے علی برادران کی فوری رہائی کا مطالبہ کیا گیا۔ مگر اور کوششوں کی طرح یہ کوشش بھی لا حاصل رہی لیکن اس واقعے سے معلوم ہو گا کہ اس زمانے میں محمد علی کی کتنی قدر و منزلت قوم پرستوں کی جماعت میں کی جاتی تھی۔

اسی عرصے میں وزیر ہند مسٹر مانتیگو اصلاحات کے لئے ابتدائی تحقیقات کرنے ہندوستان آئے۔ ملک کے تمام سیاسی لیڈروں نے ان سے ملاقاتیں کیں۔ مولانا محمد علی نے بھی خواہش ظاہر کی کہ ان سے ملاقات کریں اور مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں کی ترجمانی کریں۔ مسٹر مانتیگو نے بھی محمد علی کا ذکر سنا تھا اور ملاقات کرنی چاہتے تھے، مگر حکومت ہند نے اس ملاقات کو اپنے ”اقتدار“ کے لئے خطرناک سمجھا اور اجازت نہیں دی۔

اسی سال حکومت نے عبد المجید صاحب پرنسٹن پابند آزادی انکار

خفیہ پولیس کو چھند وارٹس بھیجا کہ علی برادران کے سامنے ایک عہد نامہ پیش کریں جس پر دستخط کرنے سے ان کو رہائی مل سکتی تھی عہد نامہ کی رو سے ان کو یہ وعدہ کرنا تھا کہ جنگ کے دوران میں وہ کوئی ایسی حرکت نہ کریں گے۔ جس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ گورنمنٹ کے دشمنوں کو کسی قسم کی اخلاقی، عملی یا مالی مدد مل سکے اور نہ کوئی ایسی بات کریں گے

جس سے ملک کے امن میں خلل ہو۔ علی برادران نے اس معاہدے پر دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ ہم کسی قسم کی پابندی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

اس کے بعد ستمبر ۱۹۱۸ء میں ایک سرکاری کمیشن مقرر کیا گیا تاکہ وہ علی برادران کی نظر بندی پر غور کرے۔ پورٹ پیش کرے۔ کمیشن کے ممبران چند واٹر آئے، دونوں بھائیوں کے بیانات لئے اور پھر اپنی سفارشات پیش کیں۔ انہوں نے نظر بندی کو بالکل جائز قرار دیا لیکن سفارش کی کہ اب سرکاری مل چکی ہے اس لئے دونوں بھائی رہا کر دیے جائیں۔ لیکن حکومت نے اس کو منظور نہیں کیا۔ مسز بیسٹ اسی سال نومبر میں رہا ہوئیں اور انہوں نے فوراً علی برادران کی رہائی کے لئے کوششیں شروع کر دیں۔ واسٹرائے سے تیس سفصل گفتگو کی اور دلائل پیش کئے مگر وہاں تو وہی ایک جواب ہٹا کہ ”ہرگز نہیں“

زندہ کی تبدیلی | چھند واڑہ کئی سال سے ان لوگوں کا وطن ہو گیا تھا مگر اب اس کو بھی چھوڑنا پڑا۔ ان دونوں بھائیوں کی کوشش سے وہاں ایک مسجد تعمیر کی گئی تھی جہاں یہ نماز پڑھا کرتے تھے۔ ایک روز بعد نماز جمعہ محمد علی نے ایک پُر جوش اور زبردست تقریر کر ڈالی جس میں مسلمانوں کو ان کا شاندار ماضی یاد دلایا اور بیداری کا پیغام دیا۔ حکومت کو یہ ناگوار گزرا اور ان کو بیٹل جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ جو تھوڑی بہت آزادی چھند واڑہ میں حاصل تھی وہ بھی سلب کر لی گئی۔

رہائی اور ترس کا تجربہ

علی برادران جیل ہی میں تھے کہ مہاتما گاندھی نے رولٹ بل کے خلاف تحریک سول نافرمانی شروع کی۔ تمام ملک میں جوش آزادی کی آگ بھڑک اٹھی، اور حکومت نے جتنا زیادہ تشدد کیا اسی قدر تحریک زور پکڑتی گئی۔ اسی عرصے میں جلیانوالہ باغ کا قتل عام ہوا اور خطرہ تھا کہ تحریک کہیں مسلح بغاوت کی صورت نہ اختیار کر لے۔ اس لئے گورنمنٹ نے اس غصہ کی لہر کو روکنے کے لئے ایک بدترانہ چال چلی۔ یعنی سب سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ درستی اور نرمی کو سمو کر ملک کے مزاج کو نئی اصلاحات بخیر چال کے لئے تیار کرے۔ اس طرح دسمبر ۱۹۳۱ء میں پانچ سال کی نظر بندی اور قید کے بعد یہ دونوں بھائی آزاد ہوئے۔

کانگریس، خلافت کا نفرین اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس امرتسر میں ہو رہے تھے اب اس لئے ان دونوں نے فوراً دھر کا رخ کیا۔ وہاں ان کا وہ شاندار استقبال ہوا کہ ہمیشہ یادگار رہیگا۔ راستے بھر ہر سٹیشن پر ہزار ہا ہندو مسلمانوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ امرتسر کے سٹیشن پر جب ان کی گاڑی پہنچی تو ایک عظیم الشان مجمع نے قومی نعروں سے ان کا استقبال کیا۔ جلوس مرتب ہو کر کانگریس پنڈال کی طرف روانہ ہوا۔ جہاں مہاتما گاندھی اور دوسرے مقتدر رہنمایان قوم ان کے خیر مقدم کے لئے جمع تھے۔ جس وقت یہ دونوں کانگریس پنڈال میں داخل ہوئے تمام حاضرین جوش میں کھڑے ہو گئے اور ہندوہ منٹ تک مسلسل تالیاں بجاتی رہیں۔ پنڈت مالویہ نے ان دونوں بھائیوں کا

تعارف کرایا اور ان کو کانگریس کا ڈیلیگیٹ بنایا۔

یادگار تقریر | کانگریس میں ایک پرجوش تقریر کرتے ہوئے محمد علی نے جو الفاظ کہے وہ بھی یادگار رہیں گے۔

”میں کہتا ہوں کہ اس آزادی کے لئے ستر تک کو بھڑیل جانا چاہئے، مجھے دوبارہ عمر بھر کے لئے نظر بند ہو جانا چاہئے ستر بیسٹ کو بھانسی پر چڑھ جانا چاہئے مگر اس قسم کے مظالم کا خاتمہ ہو جانا چاہئے جیسے پنجاب میں ہوئے“

مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس میں بھی دونوں بھائیوں کا شاندار خیر مقدم ہوا۔ اور اس کے بعد جب وہ دہلی آئے تو وہاں جس شان کا استقبال ہوا وہ شاید شاہانِ دہلی کو بھی کبھی نصیب نہ ہوا ہوگا۔

پیش کش سے انکار | مدت تک نظر بند رہنے اور کئی بار اخبادوں کی ضمانتیں ضبط ہونے کی وجہ سے اس زمانے میں

علی براور ان کی مالی حالت قابلِ اطمینان نہیں تھی۔ ان کے چند دوستوں اور قدردانوں نے ہندو اور مسلمان قائدین کی ایک کمیٹی بنائی تاکہ محقوقِ رستم جمع کر کے ان کی خدمت میں پیش کی جائے۔ لیکن محمد علی نے اس رقم کو اپنے ذاتی خرچ کے لئے لینے سے انکار کر دیا اور روپیہ کو قومی اور ملکی کاموں کے لئے دے دیا۔

وفدِ خلافت | خلافت کانفرنس میں یہ طے پایا تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے چند نمائندے ممالکِ غیر مثلاً امریکہ

انگلستان، ایران، عراق، ترکی وغیرہ جا کر وہاں مسلمانانِ عالم کے نقطہ نظر کو پیش کریں اور اس غم و غصہ کا اظہار کریں جو تمام مسلمان برطانوی حکومت کی وعدہ خلافی پر محسوس کر رہے تھے۔

جنگِ عظیم کے دوران میں مسٹر لائڈ جارج وزیرِ اعظم برطانیہ نے ہندوستانی مسلمانوں سے وعدہ کیا تھا کہ برطانوی مدبر مسلمانوں کے مذہبی جذبات و احساسات کا پورا پورا خیال رکھیں گے اور مقاماتِ مقدسہ پر خلیفہٴ المسلمین ہی کا قبضہ رہے گا۔

یہی وعدہ تھا جس کی بنا پر مسلمان انگریزوں کے ساتھ اپنے مسلمان بھائیوں سے لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن ادھر جنگ ختم ہوئی اُدھر سب وعدے رقی کی ٹوکری میں پھینک دیے گئے۔ اور ہندوستان کے مسلمان اپنی سادہ لوحی اور برطانیہ کی شاطرانہ سیاسی چالوں پر افسوس اور تعجب کرتے رہ گئے۔

مسلمانوں کو شکایت تھی کہ باوجود ان وعدوں کے مقاماتِ مقدسہ پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ تھریس یونان کے حوالہ کر دیا گیا۔ فرانس اور برطانیہ نے سلطنتِ عثمانیہ کا تمام مشرقی علاقہ دیا لیا، اور خلیفہٴ میناقی اقتدار کے بہانے سے ہر قسم کی طاقت اور قوت سے محروم کر دیا گیا۔ مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ ان وعدوں کے مطابق خلیفہ کو پوری پوری آزادی دی جائے اور ممالکِ اسلامیہ و مقاماتِ مقدسہ پر سب سابق خلافت کا قبضہ برقرار رکھا جائے۔

ان وعدوں کے ایفا کی کوشش کرنے کے لئے وفد خلافت کی تجویز محمد علی کے دماغ میں آئی۔ ان کا خیال تھا کہ ہمارا مطالبہ اس قدر صریح و واضح ہے کہ اگر معقول طریقہ سے کوشش کی گئی تو حکومت برطانیہ اس کو ضرور منظور کر لے گی۔ برطانیہ کو اس کے وعدے یا ددلانے کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ اور ملکوں کو مسلمانوں کے مطالبات سے آگاہ کر دیا تاکہ دنیا کی رائے عامہ ان کے موافق ہو جائے۔

والسٹرائے کو وعدوں کی یاد دہانی

وفد خلافت کے ولایت جانے سے پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک متحدہ وفد لارڈ جیمس فورڈ کے پاس گیا اور حکومت

برطانیہ کے وہ تمام وعدے یاد دلانے جو اس نے مسلمانوں کے ساتھ کر کے بھلا دیے تھے۔ بھلا والسٹرائے سے کیا کاربر آ رہی ہو سکتی تھی سوائے اس کے کہ انہوں نے وقتی وعدہ کر لیا کہ وہ مسلمانوں کے خیالات و جذبات کو حکومت برطانیہ کی خدمت میں پہنچا دینگے۔ اس وفد کے ارکان میں سے چند نام قابل ذکر ہیں۔ مثلاً ہما تاکا ندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی مجتہد، پنڈت موئی لال نہرو، ڈاکٹر انصاری، مسٹر محمد علی جناح، ڈاکٹر کچلو وغیرہ والسٹرائے کے سامنے جوہر تل اور مہبوطا پڈریس اس وفد نے پیش کیا وہ محمد علی ہی نے تیار کیا تھا۔ اور اس کا ایک حصہ یادگار رہے۔ وفد نے والسٹرائے سے کہا:-

”ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ برطانیہ کو خواہ کیسا ہی زبردست

سیاسی نفع ہو یا کتنا ہی بڑا اور زرخیز خطہ زمین حاصل ہو لیکن اس سے تلافی نہیں ہو سکتی اخلاقی عزت کے اُس نقصان کی جو برطانیہ کے اقتدار کو ہو گا اگر وعدے حرف بہ حرف پورے نہ کئے گئے۔

”۲“ خلاقی رعب کا خاتمہ اس لئے اور گراں معلوم ہو گا کہ اس اعلان شاہی کی قلعی کھل جائیگی جو آپ کے پیشرو وائسرائے نے ترکی کی لڑائی ہونے پر شائع کیا تھا“

ولایت کا سفر ۱۹۲۰ء میں یہ وفد ولایت کے لئے روانہ ہوا، تاکہ کانفرنس امن کے اختتام سے پہلے انگلستان پہنچ کر برطانوی حکومت پر زور ڈالا جائے کہ وہ مسلمانوں کے احساسات اور اپنے وعدوں کو یوں پامال نہ کریں۔

وفد کے صدر محمد علی تھے۔ اراکین میں سید حمین صاحب، مولینا سید سلیمان ندوی صاحب اور ابوالقاسم صاحب تھے۔ ادھر جن محمد حیات صاحب سکرٹری تھے۔ یہ کہنا بیکار ہو گا کہ اگرچہ سب اراکین نے اپنا کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ لیکن رواج رواں اس وفد کے محمد علی ہی تھے۔ اس زمانے میں ان کو بس اسی کی دُھن تھی کہ کسی طرح ترکی اور مالک سلیمان کو برباد ہونے سے بچالیں۔

انگلستان میں کوششیں جس روز یہ وفد وینس پہنچا اُسی دن انگریزی اخباروں سے اراکین وفد کو معلوم ہوا کہ کانفرنس امن دو ہی تین دن میں ترکی کا خاتمہ کرنے والی ہے۔ محمد علی نے فوراً

جا کر نہایت پُر زور برقی پیغام تمام اتحادی طاقتوں کے نمائندوں، اخباروں اور خصوصاً مسٹر لائلڈ جارج وزیر اعظم اور مسٹر مانتیگو وزیر ہند کو بھیجے۔ انکے روز جب یہ لندن پہنچے تو دارالعوام میں قسطنطنیہ کی دلیپی پر بحث ہو رہی تھی۔

انگلستان میں یہ وفد تمام ذمہ دار اہماسب سے ملا، اور ان کو مسلمانوں کا نقطہ نظر سمجھانے کی کوشش کی۔ محمد علی نے متعدد زوردار تقریریں کیں جن کا بہت کچھ اثر اے عامہ پر پڑا۔ مسٹر جارج لینسبری شوہر مزدور لیڈرنے ان کا بہت ساتھ دیا۔ اور اکثر مقامات پر جلسے کرانے میں مدد دی۔

ریمز میکڈانلڈ کی خفگی | اسی زمانے میں مزدور پارٹی کی کانفرنس ہونوالی تھی۔ محمد علی نے سوچا کہ یہ موقع برطانیہ کے عوام

کے سامنے اپنا مقصد بیان کرنے کے لئے اچھا ہے۔ اس لئے انہوں نے کوشش شروع کی کہ ان کو جنرلٹ تقریر کرنے کے لئے مل جائیں۔ مگر مشکل یہ آن پڑی کہ پروگرام طے ہو چکا تھا اور ریمز میکڈانلڈ صاحب جو سکرٹری تھے باوجود محمد علی سے پرانی ملاقات کے ان سے ناراض تھے۔ خفگی کا سبب یہ تھا کہ لندن پہنچنے پر محمد علی اور اراکین وفد میکڈانلڈ کے پاس کیوں نہ آئے، اور دوسرے لوگوں کے پاس کیوں گئے۔ اس واقعہ کے متعلق محمد علی کے الفاظ قابل ذکر ہیں جو انہوں نے کئی سال بعد ایک خط میں لکھے تھے۔

”جو شخص برطانیہ کا وزیر اعظم ہونے والا تھا وہ اس قدر کم ظرف و

تنگدل؟ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ حزب عمال کے لیڈروں سے
انہی اس قسم کی مخالفت تھی کہ میرا ان سے ملنا ان کو اتنا ناگوار ہوا
جو شخص رشک و حسد میں اس قدر ڈوبا ہوا ہو کہ ہندوستان اور
ترکی اور خود برطانیہ کے مفاد کا خیال نہ رکھے اور خیال رکھے تو
صرف اس کا کہ فلاں شخص حزب عمال کے اور لیڈروں سے کیوں
ملا اور مجھ سے کیوں نہ ملا، اُس سے جھلا کسی بھلائی کی امید
ہو سکتی ہے؟“

مزدو کا نفرین میں تقریر | پھر بھی سٹر جارج لینسبری کی کوشش سے
محمد علی کو پانچ منٹ تقریر کرنے کی اجازت

مل گئی جس انداز سے محمد علی نے تقریر کی اس سے حاضرین اتنے محظوظ ہوئے
کہ باوجود صدر کے کئی بار گھنٹی بجانے کے لوگ یہی چلاتے رہے کہ ”انہیں
اور بولنے دو“ بجائے پانچ منٹ کے محمد علی نے پورے بیس منٹ تقریر کی
اور سامعین پر نہ صرف اپنی سلاست زباں اور روانی بیاں کا سکھ بٹھا دیا
بلکہ انہیں بڑی حد تک اپنا طوفان داریا لیا۔

لندن اور پیرس سے اخبار | اس کے بعد محمد علی، مولانا سلیمان ندوی
اور دوسرے حضرات نے فرانس میں بھی

تقریریں کیں اور اپنے مقاصد کی تبلیغ کی اور پھر روم جاکر پوپ سے ملے
اور اسکو مسلمانوں کے احساسات و مذہبی جذبات سے آگاہ کیا۔ پوپ
نے ان کے مقصد سے سہروردی کا اظہار کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ ترکوں

نے عیسائیوں کے ساتھ ہمیشہ رواداری کا سلوک کیا ہے۔ اسی زمانے میں اپنے کام کی اشاعت کے لئے محمد علی نے لندن سے ”مسلم آؤٹ لک“ (مسلمانوں کا نظریہ) اور پیرس سے ”ایکوڈے اسلام“ (اسلام کی آواز بازگشت) نامی اخبارات جاری کئے۔

محمد علی نے پہلے ہی تاڑ لیا تھا کہ فرانس اور اٹلی ترکی پر زیادہ سخت پابندیاں عائد کرنے پر اسے مصر نہیں ہیں جتنی اور طاقتیں ہیں۔ اس لئے وہ بہت سے فرانسیسی قائدین سے ملے اور یہ انکی کامیابی کی دلیل ہے کہ فرانس کے اکثر مقتدر اخبارات نے ان کی تائید کی۔

لائڈ جارج سے ملاقات | آخر میں انہوں نے خود مسٹر لائڈ جارج، وزیر اعظم برطانیہ سے ملاقات کی اور نہایت جیسا کہ سے مسلمانوں کے مطالبات پیش کئے۔ برطانیہ کے وعدے یاد دلانے اور وعدہ خلافی کی شکایت کی۔

مگر ان سب کوششوں سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا سوائے اس کے کہ اتمام حجت ہو جائے اور برطانیہ کی وعدہ خلافی اور احسان فراموشی پر مہر ثبوت لگ جائے۔ اکتوبر میں محمد علی اور ارکان وفد ہندوستان واپس آ گئے۔

تحریک عدم تعاون | ابھی وفد خلافت ولایت ہی میں تھا کہ سندھ و بلوچستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک متحدہ کانفرنس ہوئی جس میں پنڈت موتی لال ہنرو، پنڈت مالویہ، ڈاکٹر مرتیج بہادر

وغیرہ شامل تھے۔ اکثریت نے طے کیا کہ خلافت اور ترکوں کو برطانیہ نے جو نقصان پہنچایا ہے اس کے خلاف ایک مؤثر احتجاج کیا جائے۔ خلافت کا نعرہ نے اپنے ایک جلسہ میں طے کیا کہ مسلمان مہاتما گاندھی کی قیادت میں کام کریں گے۔

۲۲ جون کو وائسرائے کے نام ایک بیان بھیجا گیا جس میں اُن سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اگر حکومت برطانیہ سے مسلمانوں کے مطالبات منظور نہیں کر سکتے تو وہ استعفیٰ دیدیں اور ان کی احتجاجی تحریک کی قیادت کریں۔ اس کے بعد مہاتما گاندھی نے محمد علی کو ولایت ایک برقی پیغام بھیجا جس میں انہیں اُس خط کی جو وائسرائے کو بھیجا گیا تھا اطلاع دی اور یہ اطمینان دلایا کہ ہم نے ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی طرف سے اعلان کر دیا ہے کہ اگر یکم اگست سلاطین تک مسلمانوں کے مطالبات پورے نہ ہوئے تو ہم عدم تعاون کی تحریک شروع کرنے پر مجبور ہوں گے۔

خلافت و سوانح وفد کے ناکام واپس آنے پر ملک میں حکومت کے خلاف غم و غصہ کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ مسلمانوں کو معلوم ہو گیا کہ حکومت کے وعدے کیا حیثیت رکھتے ہیں اور جب وقت آتا ہے تو وہ کس طرح اُن کو بھول جاتی ہے۔ ایسی حکومت کس برے پرانے تعاون کی امید کر سکتی تھی۔

یہ بھی اب ظاہر ہو گیا تھا کہ مشرق میں برطانوی اقتدار کی جڑ ان کا

ہندوستان پر قبضہ ہے۔ اگر ہندوستان آزاد ہو جائے تو ممالک اسلامی سے
برطانوی اثر و اتل کرنا آسان ہو گا۔

ہندوؤں نے بھی دیکھا کہ جس طرح حکومت نے مسلمانوں سے وعدے
کر کے پورے نہیں کئے اسی طرح اور ہندوستانیوں کے ساتھ بھی کریں گے
حکومت خود اختیاری کا سیر یاغ جو جنگ کے شروع ہونے پر دکھایا گیا تھا
اب فریب نظر ثابت ہو چکا تھا۔ دونوں قوموں نے مشترکہ قوت کے ساتھ
وہ تحریک شروع کی جو موجودہ ہندوستان کی تاریخ میں تحریک خلافت
دسوراج کے نام سے یادگار رہیگی۔

یہ بے ہمتیاری کی جنگ جو ہاتھ گا ندھی اور مولینا محمد علی کی قیادت میں
شروع ہوئی ہندوستان کی تاریخ قومیت کا پہلا سنہری باب ہے۔ اسکا
مفصل ذکر خود ایک ضخیم کتاب کا محتاج ہے اس لئے ہم ان چند واقعات پر
اکٹھا کریں گے جو بلا واسطہ مولینا محمد علی کی ذات سے تعلق رکھتے تھے۔

عدم تعاون کی تحریک کا ایک پہلو سرکاری تعلیمی اداروں کا مقاطعہ بھی
تھا۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں طالب علم گورنمنٹ کے کالجوں اور سکولوں کو
خیر باد کہہ کر فوجی جنگ میں شریک ہو چکے تھے۔ قومی لیڈروں کا ارادہ یہ تھا
کہ تمام سرکاری اور نیم سرکاری تعلیمی اداروں کو بند کر کے قومی ادارے قائم
کئے جائیں۔ اسی ارادہ سے محمد علی اپنے رفقاء کے ساتھ علی گڑھ آئے تاکہ پہلے
یہاں کے اربابِ حل و عقد کو دعوت دیں کہ حکومت کا دامن چھوڑ کر قوم
اور مذہب کا ساتھ دیں اور اگر وہ اس سے انکار کریں تو تابعیوں کو ترغیب دیں

کالج چھوڑ دیں۔ محمد علی، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجل خان کورٹ کے اجلاس میں شریک ہوئے اور سارا کہیں کورٹ سے اپیل کی کہ سرکاری تعلق کو منقطع کر کے کالج کو ایک قومی ادارہ بنائیں۔ کورٹ میں سرکاری عنصر آج کی طرح اس وقت بھی غالب تھا۔ اس لئے یہ تجویز ٹھکرا دی گئی۔

پھر محمد علی نے یونین میں طلباء کے سامنے ایک زبردست تقریر کی اور کہا کہ اسلام اور وطن کی خدمت کے لئے انہیں تعلیم کو خیر باد کہہ کر قومی جنگ میں شریک ہو جانا چاہئے۔ تقریر اتنی پُر اثر تھی کہ اسی وقت سینکڑوں طالب علموں نے اعلان کر دیا کہ وہ کالج چھوڑ دیں گے۔ ایک بڑی تعداد نے یہ اعلان فقط وقتی جوش میں کیا تھا لیکن پھر بھی ان طالب علموں میں سے محمد علی کو بہت سے کام کے رفقاء بنے۔

محمد علی اور ان کے ساتھی علی گڑھ میں اولڈ بوائز لاج میں ٹھہرے ہوئے تھے جو خود انہی کی کوششوں سے تعمیر ہوا تھا۔ خذ و مذ ان کالج کو یہ کہ نہ منظور تھا کہ یہ ”باغی اور سرکش“ حدود کالج میں رہ سکیں۔ انہیں حکم دیا گیا کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ جب اس سے انکار ہوا تو کالج کے افسروں نے وہ کیا جواز تک نہ ہوا تھا۔ یعنی کالج کی حدود میں پولیس بلالی گئی۔ علی گڑھ کے قابل نخر اولڈ بوائز خود ان کے بنائے ہوئے اولڈ بوائز لاج سے نکلا دئے گئے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ | علی گڑھ کالج سے محمد علی کی محبت ضرب امتحان تھی یہاں کے زمین و آسمان، عمارات اور مکانات غرض چپے چپے سے محمد علی کو مشت تھا۔ یہ ان کی مادرِ علی تھی جس کی گڑبیل بول

نے پرورش پائی تھی اور انہیں اس سے اسی قدر محبت تھی جتنی بیٹے کو ماں سے ہوتی ہے۔ لیکن اس وقت جب مسلمانوں کی عزت کا سوال تھا محمد علی نے ذاتی محبت کو قومی محبت پر قربان کر دیا اور جس کالج کے لئے رکھی وہ جان دینے کو تیار تھے اسی کے احاطہ کے باہر انہوں نے اسکے مقابلہ میں ایک نیا ادارہ قائم کیا جس کا نام ”جامعہ ملیہ اسلامیہ“ رکھا گیا۔

علامہ شیخ الہند مرحوم اس درسگاہ کے بانی تھے۔ حکیم اجل خان مرتی اور محمد علی اس کے پرنسپل۔ جو طالب علم ایم۔ اے۔ او کالج چھوڑ کر آتے تھے وہ جامعہ میں داخل ہو جاتے تھے۔ دو دوا دار سجن کے درمیان مشکل سے نصف میل کا فاصلہ ہوگا دونوں مسلمانوں کی تعلیم کے لئے قائم ہوئے تھے۔ دونوں کی بنیاد خلوص اور دردا سلامی پر رکھی گئی۔ مگر ۱۹۲۳ء میں ان دونوں کی حالت میں عبرت انگیز فرق تھا۔ ایک طرف عظیم الشان عمارتیں تھیں لیکن خالی۔ طالب علم یا تو کالج چھوڑ چکے تھے یا ان ”باغیوں“ کے ڈر سے گھر بھیج دیئے گئے تھے دوسری طرف چند بوسیدہ خیمے تھے مگر طالب علموں سے کچھ کچھ بھرے ہوئے۔ ایک طرف اگر شاندار لکچر روم اور ہال خالی پڑے تھے تو دوسری طرف درختوں کے نیچے فرش خاک یا چٹائیوں پر درس ہو رہا تھا۔ ادھر اگر کالج کا خزانہ روپے سے پُر تھا تو ادھر جامعہ کے بانی اور اساتذہ اور طالب علموں کے دل جوش قومی سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف مادی ساز و سامان کی فراوانی لیکن اخلاقی حرارت اور جوصلے کا فقدان تھا تو دوسری طرف بے سرو سامانی میں بھی جوصلے بلند اور ارادے مستحکم تھے۔ ایک طرف اگر سرکاری امداد پر بھروسہ تھا تو دوسری طرف

تائید الہی پر۔

اس طرح جامعہ ملیہ کا آغاز ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد اپنی سیاسی مصروفیت کے باعث محمد علی کو جامعہ کی باگ اپنے عزیز دوست خواجہ عبد المجید کے ہاتھ میں دینی پڑی۔ مگر اس ادارے سے ان کو ہمیشہ وہی دلچسپی اور محبت رہی اور جامعہ کی ہر امکانی مدد میں انہوں نے کبھی دریغ نہ کیا۔

ناگیو کانگریس خلافت کانفرنس | جامعہ قائم کرنے کے بعد محمد علی نے ملک کا ایک دورہ کیا اور سہرگودھا

لوگوں کو ترک موالات کی تحریک کے مقاصد سے آگاہ کیا۔ دسمبر ۱۹۲۰ء میں ناگیو میں کانگریس کا تاریخی اجلاس ہوا۔ عدم تعاون کا پروگرام منظور کیا گیا۔ اور مہاتما گاندھی کو اس کی قیادت سونپ دی گئی۔ کانگریس کے ساتھ ہی خلافت کانفرنس کا اجلاس ہوا، اور وہاں بھی ترک موالات کی تحریک میں شرکت کی تجویز پاس ہو گئی، اور مہاتما گاندھی کی قیادت منظور کر لی گئی۔

کانگریس کے اس اجلاس میں اعتدال پسند بہت بڑی تعداد میں شریک ہوئے تھے تاکہ تحریک عدم تعاون کی مخالفت کریں اور ”احتجاج“ کو بدستور ”آئینی“ طریقے پر جاری رکھیں۔ ”معتدل“ حضرات میں سی۔ آر۔ داس، پنڈت مدن موہن مالویہ، اور محمد علی جناح پیش پیش تھے محمد علی نے ان سب کو سمجھانے کی انتہائی کوشش کی لیکن پنڈت مالویہ اور جناح نے ”آئینیت“ کا دامن نہ چھوڑا۔ البتہ کئی دن کی مسلسل بحث و مباحثہ کے بعد وہ سی۔ آر۔ داس کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

یہ کانگریس کئی لحاظ سے نہایت اہم تھی۔ اقل تو ہندو اور مسلمان دونوں نے ایک متحدہ لائحہ عمل منظور کیا۔ دوسرے "معتدل" فریق ہمیشہ کے لئے کانگریس سے خارج ہو گیا۔ یہاں سے کانگریس کا "غیر آئینی" اور "باغیانہ" دور شروع ہوتا ہے۔ تیسرے محمد علی کے جوہر قیادت کے سبب قائل ہو گئے اور ہاتھ مٹا گا ندھی کے بعد ان کو ہندوستان کا سب سے بڑا لیڈر تسلیم کیا گیا۔ اب تک محمد علی کی علمی قابلیت، سلجھے ہوئے دماغ، اور ان کی تقریر کی شہرت تھی۔ اب وہ زمانہ آیا کہ لوگ ان کی سرفروشی، اور حب الوطنی کے جوہر دیکھیں۔

ہاتھ مٹا گا ندھی اور مولینا شوکت علی صاحب کے ساتھ انہوں نے تمام ہندوستان کا دورہ کیا۔ محمد علی اور گا ندھی، گا ندھی اور محمد علی۔ یہی دونام ہندوستان کے بچے بچے کی زبان پر تھے۔ اور ان ناموں کا اتحاد ہندو مسلمانوں کے عملی اتحاد کی نشانی بن گیا تھا۔ اس سفر میں محمد علی نے وہ ولولہ انگیز اور زبردست تقریریں کیں کہ ملک کے اس سرے سے اُس سرے تک حب الوطنی کی ایک آگ لگا دی۔ ہر شخص کو آزادی کا متوالا بن دیا۔ برٹشے بڑے آستانہ حکومت کے پرستار سرکار سے مخوف ہو گئے۔ ملک بھر حکومت کا مخالف ہو گیا۔ انگریز کا ڈر ہندوستانی کے دل سے ہمیشہ کے لئے نکل گیا۔ قید خانوں کو لوگ اپنا گھر سمجھنے لگے۔ لائٹھیاں دے گولیاں کھانا ایک کھیل ہو گیا۔ اتحاد کا حال یہ تھا کہ ہندو "اللہ اکبر" کے نعرے لگاتے تھے اور مسلمان "بھارت ماتا کی جے" چہکارتے تھے۔ ملک کے

گوشتے گوشتے سے اگر کوئی آواز آتی تھی تو وہ یہی تھی کہ ”بولو ہما تا گا ندھی کی بجے“
 ”بولو مولینا محمد علی کی بجے“

مدرسہ اس کی تقریر | خلافت کی تحریک ایک مذہبی تحریک تھی اس لیے بعض لوگوں کو شبہ تھا کہ محمد علی اور ان کے رفقاء کو ملکی مفاد

کا اتنا خیال نہیں ہے جتنا مذہب کا جو ش ہے۔ اس زمانے میں افغانستان کے حملے کی افواہ بھی مشہور کر دی گئی تھی۔ اس سلسلے میں مدرسہ کے مقام پر محمد علی نے جو تقریر کی تھی وہ یادگار رہے گی۔ اس تقریر کے دوران میں انہوں نے اپنی حب الوطنی کے متعلق تمام شکوک کو یہ کہہ کر مٹا دیا کہ :-

”اگر کوئی غیر ملکی طاقت خواہ وہ جرمنی ہو یا روسی یا برٹری

یا افغانستان ہمارے ملک پر حملہ کرے گی ہم سب سے پہلے

اپنے ملک کی حفاظت میں جان دینگے۔ ہم ایک دفعہ غلام

بنائے جا چکے ہیں۔ ہمیں دوبارہ غلام بننے کی کوئی خواہش

نہیں ہے“

عدم تشدد | محمد علی نے شروع سے عدم تشدد کو اس تحریک کا اور اپنا بنیادی اصول مان لیا تھا لیکن ان کی جوشیلی تقریروں

کے متعلق حکومت کا خیال تھا کہ وہ لوگوں کو تشدد کی ترغیب دیتی ہیں۔ اسی

زمانے میں پنڈت مالویہ کی کوشش سے لارڈ ریڈنگ اور مہاتما گاندھی

کی ملاقات ہوئی جس کے دوران میں وائسرائے نے شکایت کی کہ علی

برادران کی تقریریں حکومت کے خلاف نہ صرف بغاوت بلکہ تشدد کی

ترغیب دیتی ہیں۔ ہما تا گا ندھی نے کہا یہ محض غلط فہمی ہے کہ علی برادران
تشدہ کی تعلیم دے رہے ہیں حقیقت میں یہ دونوں بھائی مکمل طور پر
عدم تشدد و سکے پابند ہیں۔ بہر حال ہما تا گا ندھی نے محمد علی کو لکھا کہ تم
اس کے متعلق ایک بیان شائع کرو۔

معافی؟ اس زمانے میں مشہور کیا گیا کہ علی برادران نے حکومت سے
”باغی“ حکومت کے ڈر سے معافی نامہ لکھ دیں۔ اصل واقعہ یہ تھا کہ
ہما تا گا ندھی کی فرمائش کے بموجب دونوں بھائیوں نے ایک بیان
شائع کیا تھا جس میں صراحت کے ساتھ انہوں نے عدم تشدد کے اصول
کو تسلیم کیا تھا اور اس بات پر افسوس ظاہر کیا تھا کہ ان کی تقریروں سے یہ
مطلب نکالا گیا کہ وہ تشدد کے حامی ہیں۔ اس بیان کو حکومت کے موافقین
نے علی برادران کی معافی کے نام سے مشہور کیا۔

کراچی کا مقدمہ | کراچی میں خلافت کا نفرین کا اجلاس ہوا اور اس
میں محمد علی کی صدارت میں ایک رزلویشن پاس
کیا گیا جس کی رو سے اعلان کیا گیا کہ مسلمان کے لئے اسلام کے دشمنوں
کی اعانت اور خدمت حرام ہے۔ اس تجویز کی تائید سارے ہندوستان
میں نہ صرف مسلمان علماء نے کی بلکہ ہندو پنڈتوں نے بھی کہا کہ ہمارے
مذہب کی رو سے بھی ظالم حکومت کی امداد حرام ہے۔ ہما تا گا ندھی اور
سینکڑوں ہندو لیڈروں نے اس کی موافقت کی اور کانگریس نے

بھی اسی مصئون کا ریزولیوشن پاس کیا۔

اسی ریزولیوشن کی بنا پر علی برادران پر ترغیب بغاوت کا الزام لگایا گیا اور کراچی میں مقدمہ چلایا گیا۔ محمد علی اور ان کے ملزم رفقار نے نہایت بے پروائی اور اطمینان سے مقدمے کی کارروائی کو سنا اور جب دو سال قید بامشقت کا حکم سنا یا گیا تو ہنستے ہوئے جیل چلے گئے۔

محمد علی کے ایام اسیری میں ملک میں جو جو انقلابات ہوئے وہ لوگوں کو اب بھی یاد ہوئے۔ ان کے بعد ہزاروں آدمی جیل گئے۔ مہاتما

رہائی اور کانگریس کی صدارت

گانڈھی اور تمام لیڈر قید کر دیے گئے۔ مگر جو آگ محمد علی کی گرفتاری نے لگائی تھی وہ نہ کم ہوئی۔ دو سال بعد اگست ۱۹۲۳ء میں محمد علی رہا ہو گئے۔ اس موقع پر انہوں نے جو بیان دیا اس کا ایک فقرہ نہایت مؤثر تھا:-

”میں ایک چھوٹے جیل خانہ سے نکل کر بڑے جیل خانے میں آ گیا ہوں۔ مجھے یہ دو جیل کی کنجی کی تلاش ہے تاکہ میں گانڈھی جی کو رہا کر سکوں۔ اور اس کے حصول کا انحصار آزادی پر ہے۔“

اسی سال محمد علی کی خدمات اور قربانیوں کے اعتراف میں ان کو وہ اعزاز نصیب ہوا جس سے بڑھ کر کسی ہندوستانی کو کوئی عزت نہیں رہی جاسکتی۔ یعنی کانگریس کی صدارت۔ محمد علی کا خطبہ صدارت اپنے غیر معمولی

تھیں۔ ایک وہ زمانہ تھا جب تحریک ترک موالات کے زمانے میں ہندو
 مسلم اتحاد کا دور دورہ تھا۔ ایک یہ زمانہ آیا کہ دوسرے تیسرے مہینے
 ملک کے کسی نہ کسی گوشہ سے ہندو مسلم فساد کی خبر آتی تھی۔ بہت سے سابق
 قوم پرست اب ٹھٹھکھلا فرقہ پرستی کی تعلیم دے رہے تھے۔ کوئی شدھی میں
 مصروف تھا تو کوئی تنظیم میں۔ ہندو مسلمانوں کو فسادات کا ذمہ دار ٹھہرتے
 تھے اور مسلمان ہندوؤں کو۔ لیکن محمد علی کا نظریہ تھا کہ کسی ایک فرقہ کو مورد الزام
 ٹھہرانا حاصل ہے۔ وہ کہتے تھے کہ فضا ایسی پیدا کر دی گئی ہے کہ اس قسم کے
 فسادات کا ہونا لازمی ہے۔ انہوں نے اتحاد پیدا کرانے کی کوشش جاری
 رکھی۔ ملک بھر میں مارے مارے پھرے۔ یونین کانفرنس منعقد کرائی۔
 ہندو مسلمان لیڈروں کی خوشامد کی۔ لیکن ساری دوڑ دھوپ بیکار ثابت
 ہوئی۔ اور ملک کی سیاسی فضا بد سے بدتر ہوئی گئی۔

حجاز زوج | اسی زمانے میں حجاز میں غیر معمولی انقلابات رونما ہو رہے
 تھے۔ شریف حسین اور ابن سعود کی جنگ جاری تھی چلو
 نے ایک اعلان شائع کیا جس میں حجاز کی حالت ناقابلِ اطمینان بتائی گئی اور
 حاجیوں کو "مشورہ" دیا گیا کہ وہ حج کو ملتوی کر دیں۔ محمد علی نے اس کی سخت
 مخالفت کی اور ملک بھر میں کوشش کی کہ لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں حج
 کو جائیں۔ ہزاروں حاجی اس سال محمد علی کی کوشش سے گئے اور کسی کا بال
 بیکا نہ ہوا۔

شریف حسین کی بد اعمالیوں کی وجہ سے محمد علی اس کے مخالف تھے اور

چونکہ ابن سعود نے اعلان کیا تھا کہ وہ شخصی حکومت نہیں بلکہ حجاز کی جمہوری حکومت قائم کرے گا اس لئے اس کی موافقت کر رہے تھے۔ مگر ابن سعود کی مخالفت اس کے ”وہابی“ ہونے کے سبب سے نہایت زوروں پر رہتی۔ اسی سلسلے میں محمد علی کی بھی شدت سے مخالفت کی گئی، بطرح طرح کے الزامات لگائے گئے مگر انہوں نے اپنی رائے کو انہیں بدلا۔ مزارات مقدسہ کے اہتمام کے مسئلہ میں محمد علی مخالفین ابن سعود کی بھیجی ہوئی خبروں پر یقین کرنے سے پہلے یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے نمائندے خود جا کر صورت حال کا معائنہ کریں۔

مگر اصول پرستی اس کا نام ہے کہ علی الاعلان ابن سعود کے حامی ہونے کے باوجود جس وقت خبر آئی کہ اس نے حجاز کی ”بادشاہی“ قبول کر لی ہے، محمد علی اس کی مخالفت میں پیش پیش ہو گئے۔ وہ فطرتاً جمہوریت پسند واقع ہوئے تھے اور خانہ خدا پر کسی شخصی حکومت کا قبضہ ہونا انہیں ہرگز گوارا نہ تھا۔

مؤتمر اسلامی ۱۹۲۶ء میں ابن سعود نے مؤتمر اسلامی کا اعلان کیا اور محمد علی مع وفد خلافت کے اس میں شرکت کی غرض سے تشریف لے گئے۔ خود ابن سعود نے مؤتمر کی صدارت کی مگر محمد علی عرب میں آنے والے نہ تھے۔ انہوں نے وہیں بھرے جلسے میں ابن سعود کو مخاطب کر کے بیباکانہ طریقہ سے تقریر کی اور کہا کہ اسلام نے شخصی حکومت اور ملوکیت کی نیخ کنی کی ہے۔ تم جو اپنے آپ

کو رسول کا نائب بتاتے ہو کیوں قیصر و کسریٰ کی پیروی میں ”بادشاہی“ قائم کر رہے ہو۔

حجاز میں مہدم کی ہوئی عمارات مقدسہ کو بھی محمد علی نے اپنی ہتھکوں سے دیکھا اور حبیب ابن سعود نے ان کو دوبارہ تعمیر کرانے کا ذمہ نہیں لیا تو ان کی مخالفت اور سختی ہو گئی۔

فرقہ پرستی اب وہ زمانہ آتا ہے جب یہ خیال کیا جانے لگا کہ محمد علی کا رجحان قوم پرستی سے ہٹ کر فرقہ پرستی کی طرف ہونے

لگا ہے۔ ملک کی فضا اس وقت عجیب تھی۔ فرقہ پرستانہ ذہنیت کا دور دورہ تھا۔ شیعہ اور سنی گٹھن اور تبلیغ اور تنظیم کا چرچا تھا۔ ہندو مسلم فسادات عام تھے۔ محمد علی اس قسم کی تحریکات سے شروع ہی میں بیزاری کا اظہار کر چکے تھے۔ اور مسلمانوں کے فرقہ پرست اور دشمن اتحاد فریق سے جگمگ آنا تھے۔

مگر انہوں نے یہ محسوس کیا کہ جس دلیری سے وہ مسلمان فرقہ پرستوں سے لڑ رہے تھے اس طرح ہندو لیڈر اور اکثر کانگریسی ہندو اپنے یہاں کے فرقہ پرستوں سے لڑنے کے لئے تیار نہ تھے۔ کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ ہندو مہاسبھا، مونچے اور مشروہا تہ کے خلاف محاذ جنگ قائم کرے۔

سنی ۱۹۲۲ء میں پشیل خلافت کانفرنس منعقد ہوئی جس کی غرض و غایت محمد علی نے یوں بیان کی کہ ”جب پنڈت موتی لال نے مہاسبھا یوں کو ایک حرف بھی کہنے سے انکار کر دیا تو حکیم اجمل خان صاحب مرحوم نے بڑھ کر ان سے صاف کہہ دیا کہ اب وہ مسلمانوں سے کچھ امید نہ رکھیں“

بہر حال اس کانفرنس میں کوئی تجویزیسی پاس نہیں ہوئی جس میں اعلان جنگ یا کانگریس اور ہندوؤں سے بیزاری کا اظہار ہو بلکہ کانفرنس کے بعد محمد علی نے جو مسلمانوں کے نام اپیل کی اس میں فرمایا :-

”یہ ملک کے لئے سخت ترین ابتلا و آزمائش کا زمانہ ہے نہ آپ خود مشغول ہوں نہ اپنے کسی لفظ سے یا عمل سے اہل ہندو کو مشغول ہونے کا موقع دیں۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ اگر وہ تمہارے اوپر ہاتھ اٹھائیں تو سر جھکا دو اگر چھری دکھائیں تو سینہ آگے کر دو، اگر ظلم کریں تو صبر سے کام لو۔“

مگر یہ اب صاف ظاہر تھا کہ وجہ خواہ کچھ بھی ہو وہ اشتراک عمل اور اتحاد جواب تک محمد علی اور دیگر کانگریسی لیڈروں کے درمیان رہا تھا اب آہستہ آہستہ مفقود نہیں تو کمزور ضرور ہوتا جا رہا تھا۔

کتابِ راجپال جولائی ۱۹۲۷ء میں ایک شخص راجپال نامی نے ایک کتاب شائع کی جس میں سول کریم پر نہایت بے ادبانہ اور رکیک حملے کئے گئے تھے۔ اس کتاب کے شائع ہوتے ہی مہاتما گاندھی نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ مسلمانوں میں تو اس کی اشاعت سے ایک آگ لگ گئی۔ ہر شخص اس کی ضبطی اور مصنف کو سزا دینا کا مدعی تھا۔ پنجاب ہائی کورٹ میں جسٹس دلپ سنگھ نے مصنف کو بری کر دیا اس پر شورش اور بڑھی اور جسٹس دلپ سنگھ مستعفی ہو جاؤ کی آواز تمام اسلامی مہندسے بلند ہوئی۔ ایسے وقت میں عوام کی رائے کی مخالفت کرنے کی ہمت

سوائے محمد علی کے کوئی نہ کر سکتا تھا۔ ان کا نظریہ تھا کہ دلیپ سنگھ نے جان بوجھ کر بے انصافی نہیں کی۔ قصور اس کا نہیں بلکہ قانون مضابطہ فوجداری کا ہے کہ اس میں کوئی صاف اور واضح دفعہ مذہبی پیشواؤں کی توہین کو رد کرنے کے لئے نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ہنگامے میں محمد علی کی کون مٹتا تھا۔ رائے عامہ کے سیلاب کے ساتھ بہنا آسان ہے اس کی مخالفت ہمت اور جوا مردی کا کام ہے۔ محمد علی کو دشمنوں نے گالیاں دیں۔ دوستوں نے برا بھلا کہا۔ مگر انھوں نے اپنی رائے کو نہ بدلا۔ بلکہ پیہم کوششوں سے شورش کو ٹھنڈا کیا۔ اسی وقت انہوں نے ایک قانون کا سودہ بنایا جس کی رو سے کسی مذہب یا مذہبی پیشوا کی توہین قانونی جرم قرار دی جائے یہ قانون سر ذوالفقار علی خان نے پیش کیا اور کثرت رائے سے اسمبلی میں پاس ہوا۔

آل پارٹیز کانفرنس | باوجود ناموافق نضا کے محمد علی اب بھی اسی گوش میں تھے کہ کسی طرح ہندو مسلمانوں میں مصالحت

ہو جائے۔ کئی "یونٹی کانفرنس" ہوئیں مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ۱۹۳۱ء میں پھر کوشش ہوئی کہ ایک کانفرنس تمام قابل ذکر جماعتوں کے نمائندوں کی "آل پارٹیز کانفرنس" کے نام سے کی جائے۔ کانفرنس کے ابتدائی جلسوں میں ملک کے نمائندوں کی کافی تعداد شریک ہوئی۔ مگر جب طرفین تعصب کا جواب تعصب سے اور غصہ کا جواب غصہ سے دیں تو صلح کیا خاک ہو گئی۔ مہا سمحا اور سلم لیگ کے نمائندوں کی تو تو میں میں کے بعد یہ کانفرنس بھی "ملتوی" ہوئی۔

”چودہ نکات“ جب دوسری کوششیں ناکام رہیں تو محمد علی نے چاہا کہ مسلمان پہلے آپس میں متفق ہو جائیں اور پھر کانگریس

سے اتفاق کر لیں تاکہ قومی آزادی کا کام جاری رہے۔ دہلی میں اسمبلی کے اجلاس کے زمانے میں انہوں نے جناح صاحب کی شرکت میں مسلمانوں کے نمائندوں کی ایک کانفرنس کی۔ محمد علی کی کوشش سے اکثریت مخلوط انتخاب کے موافق ہو گئی۔ اور ”چودہ نکات“ منظور کئے گئے جن پر سب متفق تھے۔ یہ چودہ نکات اب ملک بھر میں ”جناح کے چودہ نکات“ کے نام سے مشہور ہیں اور مسلمانوں کی سیاسی انجمنوں کی عقل و فکر کا مدار انہی پر ہے۔ یہ نکات محمد علی نے کانگریس کے سامنے پیش کئے اور وہاں بھی منظور کر لئے۔ مگر فرقہ پرست ہندوؤں اور فرقہ پرست مسلمانوں کی مخالفت جاری رہی اور ملک کی فضا میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ ہوئی۔

سائمن کمیشن ۱۹۲۷ء میں انگلستان کی مزدور گورنمنٹ نے سائمن کمیشن کا تقرر کیا جس کے رکن سب انگریز تھے اور جس کا

مقصد ہندوستان کے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک دستور اساسی تجویز کرنا تھا۔ کانگریس تو اس کمیشن سے بیزار تھی ہی۔ معتدل طبقہ نے جب دیکھا کہ حکومت نے اس کو بھی نظر انداز کیا ہے تو وہ بھی مخالفت ہو گیا۔ مسلمانوں کے جتنے خطاب یافتہ خود ساختہ ”لیڈر“ تھے وہ تو اس کمیشن سے تعاون کرنا فرض سمجھتے تھے۔ لیکن بعض قوم پرست مسلمان بھی ہندوؤں سے اتنے دل برداشتہ تھے کہ اس کمیشن سے تعاون کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

سر محمد شفیع سرکاری پارٹی کے سرگروہ تھے۔ اتفاق سے اس سال انکا انتخاب مسلم لیگ کی صدارت کے لئے ہوا تھا۔ جنل صاحب جو لیگ کی کانسل کے صدر تھے وہ کمیشن کے مخالفت تھے۔ غرض ان دو صدور میں مخالفت کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس سال لیگ کے دو اجلاس ہوئے۔ سر شفیع نے لاہور میں جلسہ کر کے کمیشن کی موافقت کا ریزولوشن پاس کرایا۔ کلکتہ میں محمد علی کی کوشش سے کمیشن کی مخالفت کی تجویز پاس ہوئی اور چودہ نکات جن میں بہت سی شرطوں کے ساتھ مخلوط انتخاب کی حمایت تھی منظور ہو گئے۔

محمد علی نے کمیشن کی مخالفت میں تقریریں کیں، مضامین لکھے اور ہر طرح بائیکاٹ کو کامیاب بنانے میں مدد دی۔

نہرو رپورٹ | سائمن کمیشن کے مقاطعہ کے وقت جو تھوڑا بہت اتفاق رائے اور اتحاد عمل ہندوؤں اور مسلمانوں میں قائم ہوا تھا وہ نہرو رپورٹ نے بالکل ہی ختم کر دیا۔ لارڈ برکن ہیڈ نے ہندوستانیوں کو چیلنج دیا تھا کہ اگر ان میں اتنی قابلیت ہو تو ایک دستور اساسی بنا کر دکھائیں۔ اس کے جواب میں یہی میں آل پارٹیز کانفرنس منعقد کی گئی جس نے ایک کمیٹی پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں بنادی تاکہ وہ ہندوستان کیلئے ایک دستور اساسی تیار کرے۔

اگست ۱۹۲۸ء میں لکھنؤ میں یہ رپورٹ آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس میں پیش کی گئی۔ محمد علی اس وقت علاج کے لئے یورپ گئے ہوئے تھے۔ شوکت علی شریک جلسہ تھے۔

رپورٹ میں ”حکومت بہ طرزِ نوا بادیات“ کے اصول پر دستوراسامی تیار کیا گیا تھا مسلمانوں کو یہ شکایت تھی کہ ان کے پورے ”چودہ نکات“ اس میں نہیں رکھے گئے۔ حسرت موہانی اور شوکت صاحب نے رپورٹ سے اختلاف کیا۔ مگر وہ یہ کثرتِ رائے پاس ہو گئی۔ محمد علی حبیب اپنے علاجِ کنہج میں چھوڑ کر ہندوستان واپس آئے تو انہوں نے بھی اس رپورٹ کی مخالفت کی۔ عام مسلمان رپورٹ سے ناراض تھے۔ مگر ایک معقول تعداد قوم پروروں کی اس کی حامی تھی۔

ہندو رپورٹ کے شائع ہوتے ہی نا اتفاقی اور فرقہ وارانہ مخالفتوں کا بازار گرم ہو گیا۔ کانگریس نے رپورٹ کو منظور کر لیا۔ اس سے محمد علی اور بھی بد دل ہو گئے۔ قومی کنونشن میں مخالفت کی مگر وہاں بھی ناکامی ہوئی۔ محمد علی کی مخالفت دو وجوہ پر مبنی تھی۔ ایک تو یہ کہ رپورٹ میں مکمل آزادیِ نصیبین بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے مطالبات منظور نہیں کئے گئے تھے۔

اس وقت محمد علی نے ایک دردناک بیان شائع کیا جس میں کانگریس سے اپنے اختلافات کی وجوہ کو بیان کیا۔ خواہ کانگریس کا ساتھ چھوٹے نہیں محمد علی حق بجانب ہوں یا نہ ہوں یہ بیان پڑھنے کے بعد ان کے خلوص سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

مسلم کانفرنس | دل برداشتہ اور مایوس انسان کہاں سے کہاں پہنچتا ہے۔ کانگریس کو چھوڑ کر محمد علی آل پاٹھنیر مسلم کانفرنس

میں شریک ہوئے جو آغا خان کی صدارت میں دہلی میں منعقد ہوئی۔ قوم پرست مسلمانوں نے اس میں شرکت سے انکار کر دیا تھا۔ اور یہ ظاہر تھا کہ صدر اور اراکین کانفرنس کی اکثریت محمد علی کے تحیل مکمل آزادی سے کوسوں دور ہیں۔ سر شفیق مرحوم اس کے روح رواں تھے اور لوگوں کو تعجب ہوتا تھا کہ یہ دونوں جو آج تک ایک دوسرے کے شدید سیاسی مخالفت تھے۔ آج ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہیں۔ کانفرنس کے اراکین نے محمد علی کو شریک کرنے کیلئے یہ طے کیا کہ کانفرنس اپنا سیاسی نصب العین مقرر نہ کرے تاکہ ہر جماعت کو اختیار رہے کہ وہ اپنے اپنے نصب العین پر قائم رہے۔ مگر مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے سب جماعتیں اشتراک عمل کریں۔

سر محمد شفیع نے اصل تجویز پیش کی جس میں مسلمانوں کے مطالبات اضع کئے گئے تھے اور یہ اعلان تھا کہ جب تک یہ منظور نہ کئے جائیں مسلمان کسی دستور اساسی کو قبول نہ کریں گے۔

محمد علی نے اس موقع پر اس ریزولیشن کی تائید میں جو تقریر کی اس کا ایک حصہ قابل ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اس کانفرنس میں شرکت کرنے کے ان کے دل میں اب بھی اتحاد کا جذبہ کس زور شور سے موجود تھا۔ آپ نے فرمایا:-

”میں انگریزی حکومت سے بیزار ہوں۔ میں دوسروں کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ میرے ہم خیال بن جائیں۔ میں تو انگریزی حکومت سے اس قدر بیزار ہوں کہ اگر مجھے انگریزوں کی غلامی سے

نجات حاصل کرنے کے لئے ہندوؤں کی غلامی قبول کرنی
پڑے تو میں اسے قبول کر لوں گا میں نے ابھی
تک صلح کا دروازہ بند نہیں کیا ہے۔ میں صلح کو پسند
کرتا ہوں اور اسن و اتحاد کا حامی ہوں ۱۱

گول میز کانفرنس | کیا وجہ تھے جن کی بنا پر محمد علی جیسے شخص
نے جو مکمل آزادی کے حامی تھے۔ گول میز

کانفرنس میں شرکت کی دعوت کو منظور کر لیا؟ یہ بحث اب بیس کا رہے۔ مگر
واقعہ یہ ہے کہ باوجود شدید علالت کے محمد علی نے یہ طویل طویل سفر قوم اور
ملک کی خدمت کے لئے اختیار کیا۔ کس کو معلوم تھا کہ یہ شیر مرد اپنے آخری سفر
پر روانہ ہو رہا ہے!

انگلستان جاکر محمد علی نے ہندو اور مسلمان مندوبین کے درمیان
مصالحت کی پوری کوششیں کیں تاکہ کم سے کم دیا بغیر میں تو آپس کی باتوں
کا راز نہ کھلے۔ مگر یہاں مسلمان مندوبین چُن چُن کر ایسے بھیجے گئے تھے جو کسی طرح
مصالحت پر آمادہ نہ ہوں۔ ادھر مندوب بھی بہت دھرمی پر تلے ہوئے تھے۔
ایک کا ایمان اگر فرقہ دارانہ نیابت تھی تو دوسرے کا دھرم مشترکہ انتخاب۔
حال باوجود شدید علالت اور نقاہت کے محمد علی نے ایک ایسی تجویز تیار کی
تھی کہ اگر فرشتہ موت نے مہلت دی ہوئی تو اغلب یہ کہ وہ سب کو اس
تجویز پر متفق کرانے پر کامیاب ہو جاتے۔

تاریخی تقریر | ان گول میز کانفرنس میں انہوں نے وہ زبردست تقریر

کی جس نے دو ملکوں کو ہلا دیا۔ ایسی بے دھڑک آزادانہ اور زوالہانہ تقریر بھی گول مینہ کانفرنس میں کاہے کوئی گئی تھی۔ محمد علی کی خطابت ان کا پاکیزہ مذاق، زبان کی سلاست اور روانی، خیالات کا زور اور جوش اور سستے بڑے حکریں قومی جذبات کی بے باکانہ نمائندگی۔ یہ ایسی چیزیں تھیں کہ وہ تقریر ہندوستان اور انگلستان کی تاریخ میں یادگار ہو گئی جس وقت ہندوستان کے اخباروں میں شائع ہوئی تو لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں، مخالفوں کی مخالفت ہوا ہو گئی اور ان قومی اخباروں نے جو آج تک محمد علی کا مذاق اڑا رہے تھے اسکی تعریف و توصیف میں کالم کے کالم رنگ ڈالے۔

اس تقریر کا ایک حصہ تو ایسا ہے کہ وہ ہندوستان کی آزادی کی تاریخ میں سونے کے الفاظ سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ انگریز اور ہندوستانی سندوبین کے اس بھرے مجمع میں آپ نے فرمایا:-

”میں آپ سے درجہ استمرات لینے کے لئے نہیں آیا۔ میں مکمل آزادی کے عقیدے کا پابند ہوں۔“

آج جس مقصد کے لئے یہاں آیا ہوں وہ یہی ہے کہ میں اپنے ملک کو واپس جاؤں تو آزادی کا منشور میرے ہاتھ میں ہو۔ میں غلام ملک میں لوٹ کر نہیں جاؤں گا۔ مجھے ایک غیر ملک میں جے آزادی کا شرف حاصل ہے غربت کی موت منظور ہے۔ اور اگر آپ مجھے ہندوستان کی

آزادی نہیں دینگے۔ تو پھر آپ کو مجھے یہاں قبر کے لئے جگہ
دینی پڑے گی۔“

محمد علی قول کا دھنی تھا۔ اس نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ بیمار پہلے
سے تھے۔ سفر کی صعوبت، ڈاکٹروں کی سخت ممانعت کے باوجود
فرقہ دارانہ مفاہمت کے لئے دوڑ دھوپ اور اس تقریر کی تکیاں سے
حالت اور خطرناک ہو گئی۔ ران الفاظ کے ادا کرنے کے چند ہی دن بعد
یہ جواں مرد اور جواں ہمت انسان اس دایر فانی کو چھوڑ کر عالم جاودانی کی
طرف رخصت کر گیا۔



ایک جامع شخصیت

محمد علی جوہر کے بعد ہندوستان میں اور بہت سے ملک اور قوم کے فدائی اور قائد پیدا ہوں گے لیکن ایسی جامع شخصیت کا پیدا ہونا دشوار ہے جو ایک ہی وقت میں اسلام کا شیدائھی ہو اور ملک کا عاشق بھی۔ شاعر بھی ہو اور نثار بھی، بذلہ سچ بھی ہو اور حق گو بھی، جس کا غزم اور استقلال پہاڑ سے ٹکڑے کھائے، اد جس کی نرم اور شیریں گفتگو میں آپ رداں کا لطف آئے جس کی دوستی خلوص کی تصویر اور دشمنی شرافت کا مریخ ہو، جس کی اصول پرستی مسلم اور رواداری مشہور ہو۔

محمد علی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں میں فصل بخت خود ایک کتاب کی محتاج ہے اس لئے یہاں مختصر ان کی چند ممتاز خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

دلیری اور حق گوئی | موجودہ زمانے میں سیاست اسی کا نام ہے کہ سچی بات نہ کہی جائے۔ یا اگر کہی جائے تو اس طرح گول گول اور مبہم الفاظ میں کہ اس کا تمام اثر زائل ہو جائے۔ مگر محمد علی نے عمر بھر انتہاء درجہ کی دلیری اور حق گوئی کا ثبوت دیا۔ جس بات کو وہ حق سمجھتے تھے اس کے کہنے میں دوست اور دشمن، حاکم بادشاہ کسی سے نہ جھکے تھے۔ اکثر لیڈر ایسے مجموعوں سے بہت گھبراتے ہیں جہاں اکثریت

ان کی مخالفت ہو۔ رائے عامہ کے سیلاب کے ساتھ ساتھ ہننا آسان ہے اس کے دھارے پر چڑھنا۔ شکل۔ مگر محمد علی کبھی کسی مجمع سے نہیں دیے۔ ہندوستان کے عوام کا ہویا انگلستان کے دارالعوام کا۔ مؤثر اسلامی میں ابن سعود کو اسکے منہ پر ایسی کھری کھری سنائیں کہ لوگ ان کی بیباکی پر رنگ رہ گئے۔

ایک دفعہ وائسرائے کے پاس مسلمانوں کا ایک وفد لیکر گئے۔ لارڈ اردون نے ان کے نقطہ نظر سے اتفاق کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ محمد علی نے اسی وقت ان سے کہا کہ ”اب ہماری آپ کی جنگ ہوگی صلح و سلام کا خاتمہ ہے“ اور جب وائسرائے نے کہا کہ ”مجھے امید ہے آپ کی جنگ آئینی اور قانون کی حدود میں ہوگی“ تو آپ نے فوراً جواب دیا۔

”خدائی قانون کی اطاعت میرا اولین فرض ہے، اور اسی کی اطاعت میں کروں گا۔ اگر اس کی بجائے اور میں لارڈ اردون کی حکومت کے قوانین مانع آتے ہیں تو مجھے ان کی پروا نہیں ہے“

اسلام کا سپاہی | محمد علی کی زندگی کے دور آخر میں ان پر مذہبیت کا رنگ بہت غالب تھا۔ اگرچہ انہوں نے انگریزی

تعلیم پائی تھی لیکن طالب علمی کے بعد اپنے شوق سے اسلامی فلسفہ، فقہ اور ادب کا کافی مطالعہ کیا تھا۔ اور جتنا زیادہ انہوں نے اپنے مذہب کا مطالعہ اور اس پر غور کیا اتنا ہی وہ اسلام کی سچائی اور عظمت کے قائل ہوتے گئے۔

اسلام اور مسلمانوں سے ان کی محبت کا یہ حال تھا کہ تمام دنیا میں کسی جگہ مسلمانوں پر کوئی آفت یا مصیبت آئی اور وہ ان کی حمایت کو کھڑے ہو گئے۔

محمد علی ہمیشہ فخر سے کہتے تھے کہ میں اسلام کا سپاہی ہوں اور واقعہ بھی یہ ہے کہ حسنِ لیاقت اور جواں مردی سے وہ اسلام کی عظمت، شوکت، عزت و حرمت کے لئے لڑتے رہے۔ وہ اسلام کے ایک سچے سپاہی کی شان تھے۔

تحریکِ خلافت کا مقصد یہی تھا کہ اسلامی دنیا کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے اور اسلام کی عظمت و وقار کو صدمہ نہ پہنچے۔ اس تحریک کو کامیاب بنانے میں انہوں نے کیا کچھ قربانیاں نہیں کیں۔ نظر بند رہے، جیل گئے، مالی مشغلات برداشت کیں، چین اور آرام اپنے پرچہ کر لیا۔ مگر جب تک دم میں دم رہا اسلام کی خدمت سے ٹھہر نہ موڑا۔ ملک بھر میں جہاں کوئی تحریک مسلمانوں کی بہبودی کے لئے شروع ہوتی تھی وہ اس کی امداد میں دامے درمے سخنے کسی طرح دریغ نہ کرتے تھے۔ علی گڑھ کالج کے لئے انہوں نے کیا کچھ کوششیں نہ کیں لیکن جب ان کو یقین ہو گیا کہ اس کالج کا وجود مسلمانوں کے لئے مفید نہیں بلکہ مضر ہے تو اسے چھوڑ کر جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کی تاکہ مسلمان اصل معنوں میں آزاد و قوی اور ملی تعلیم حاصل کر سکیں۔ اور اس نئے ادارے کے استحکام اور ترقی کی وہ مرتے دم تک کوشش کرتے رہے۔

مسئلہ حجاز میں جب تک وہ یہ سمجھتے رہے کہ ابن سعود کی امارت اسلام کے لئے فائدہ مند ہوگی وہ اس کی حمایت میں کمر بستہ رہے۔ گو انہیں اپنے دیرینہ دوستوں اور رفیقوں کی مخالفت برداشت کرنی پڑی۔ لیکن جب حجاز جا کر ان کو یقین ہو گیا کہ ابن سعود اسلامی جمہوریت کے بجائے اپنی خاندانی بادشاہت قائم کر رہا ہے تو ان کو بھرے جلسے ابن سعود کی مخالفت کرنے میں کوئی تکلف نہ ہوا۔

اسلام کے متعلق محمد علی کا جو نظریہ تھا وہ انہوں نے خود اپنی گول میز کانفرنس والی تقریر میں بیان کیا تھا۔

”مذہب صرف عقیدے اور رسم کا نام نہیں ہے میرے نزدیک مذہب زندگی کے حقائق کا ترجمان ہے۔ مجھے اسلام کے صدقے میں تہذیب، معاشرتی نظام اور زندگی کا اُمید افزا مستقبل حاصل ہے۔ اسلام ان تمام باتوں کا مکمل مجموعہ ہے۔ جہاں خدا کے حکم کا سوال ہو وہاں میں پہلے مسلمان ہوں اور آخر تک مسلمان رہوں گا۔۔۔۔۔“ میرا پہلا فرض یہ ہے کہ میں اپنے خدا کا حکم مانوں نہ کہ ملک معظم کا۔“

قوم پرست؟ | ہندوستان کے موجودہ دور کے مورخ کو منجملہ اور سوالوں کے اس سوال کا بھی جواب دینا ہو گا کہ آیا محمد علی حقیقی معنوں میں قوم پرست تھے یا نہیں۔ اور اگر وہ مورخ

غیر متعصبانہ نظر سے محمد علی کی سیرت کا مطالعہ کر گیا۔ تو اسکو بھی یہی جواب دینا ہوگا کہ وہ قوم پرست ہوں یا نہ ہوں قوم پرور اور قومی خادم ضرور تھے۔ محمد علی "قوم پرستی" کے قائل نہ تھے یعنی وہ یورپ کے قوم پرستوں کی طرح قوم کو دیوتا بنا کر پوجنے کے خلاف تھے۔ طبیعتاً وہ بین الاقوامیت کے قائل تھے، اور جغرافیائی حدود کے پابند ہونے سے انکار کرتے تھے۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ "قوم پرستی" کا جنون ترقی پانے پر کس طرح دنیا کے امن اور ترقی میں حاح ہوتا ہے۔ جنگیں "قوم پرستی" کے نام پر لڑی جاتی ہیں اور ہزاروں لکھ لاکھوں کا خون اس دیوتا کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ پھر وہ فطرتاً ایک مذہبی انسان راق ہوئے تھے۔ اور وہ اس مذہب کے شیدائی تھے جو تمام عالم کو ایک نظر سے دیکھتا ہے جس میں جغرافیائی حدود اور سیاسی تقسیم کوئی معنی نہیں رکھتیں، جو حقیقی معنوں میں ایک بین الاقوامی مذہب ہے۔ محمد علی نے اپنے اس نظریۂ کو اپنی گول میز کانفرنس والی تقریر میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا تھا۔

"میں کہتا ہوں کہ خدا نے انسان کو بنایا اور شیطان نے قوموں کو۔ قوم پرستی انسانوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتی ہے لیکن مذہب انسانوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کرتا ہے"

ایک اور موقع پر انہوں نے فرمایا "اسلام وطن پرور ہے، وطن پرست

نہیں"

اور یہی حقیقت میں محمد علی کا مسلک تھا۔ باوجود تو سیت کے تنگ نظریہ کے مخالف ہونے کے وہ اپنے وطن کی سچی محبت رکھتے تھے اور اس کی خدمت کو وہ اپنا اولین فرض سمجھتے تھے اس کی آزادی کے لئے وہ برابر کوشاں رہے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ اگر امیر کابل ہندوستان پر حملہ آور ہوں تو آپ کا کیا فرض ہوگا تو آپ نے فرمایا "میں ان کے خلاف صفت آرا ہو کر ان کا ممتا بلہ کر دوں گا۔ اور اپنے عزیز وطن کو کسی غیر کا غلام نہ ہونے دوں گا۔"

وطن سے اُن کی محبت آخر وقت تک قائم رہی اور ہندوستان کی آزادی کے لئے انہوں نے کبھی کوشش اور قربانی سے دریغ نہ کیا۔ یہاں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ جب ۱۹۲۷ء کی کانگریس میں پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنا "مکتل آزادی" کا ریزولوشن پاس کرنا چاہا تو یہ محمد علی ہی تھے جنہوں نے اس تجویز کی پر زور موافقت کی تھی۔

اپنی عمر کے آخری حصہ میں وہ کانگریس سے علیحدہ ہو کر مسلمانوں کی تنظیم میں مصروف رہے تھے اور لوگوں کا خیال ہو چلا تھا کہ محمد علی بھی اور فرقہ پرستوں کی طرح اب قوم پرور نہیں رہے۔ لیکن گول میز کانفرنس میں اپنی دلولہ انگیز تقریر سے انہوں نے ثابت کر دیا کہ مرتے دم تک ان کا دل وطن پرستی کے جذبے سے معمور تھا۔

شاعر بہت کم لوگ محمد علی کی شاعری سے واقف ہیں ان کی سیاسی اور قومی شخصیت اس قدر زبردست تھی کہ کسی کو خیال بھی نہ گزرتا تھا کہ یہ شخص جو ملک و قوم کی خدمت میں اُن تھک کوششیں کرتا ہے یہ ایک شاعر کی نظر اور

شاعر کا دل بھی رکھتا ہے۔ فن کے نقطہ نظر سے محمد علی اردو شعرا کی صعب اول میں جگہ نہیں پاسکتے۔ ممکن ہے کہ ان کی شاعری اور ترقی کرتی اگر وہ پوسے انہماک سے اس میں دلچسپی لیتے لیکن ان کا مستقل کام شاعری نہیں بلکہ قوی خدمت تھا کبھی کبھی خدمت میں شعر کہہ لیتے تھے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے شعروں میں ایک خاص درد اور سوز ہوتا تھا جو سننے والوں پر اثر کئے بغیر نہ رہتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ محمد علی جوہر کے شعر ان کے دل کی آواز ہوتے تھے۔ بقول مولینا عبدالمالک صاحب دریا بادی کے:-

”جوہر کی شاعری ان کے قلب کی زبان“ ان کے جذبات کی ترجمان اور ان کے واردات کا بیان ہے۔ آورد، تصنع اور تکلف کا ان کے ہاں گزر نہیں۔“

مثال کے لئے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

تقریباً نہی سمجھنا کہ فن میرے لئے ہے	پر غیب سے سامان بقا میرے لئے ہے
پیغام ملا تھا جو حسین ابن علی کو	خوش ہوں وہی پیغام تھا میرے لئے ہے
توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں بندے	یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے
کیا ڈر ہے جو ہو ساری خلعتی ہی مخالفت	کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے

گلہ اے دل بھی سے کرتا ہے	عشق کا دم اسی پہ بھرتا ہے
جان دیتا ہے عیشِ فانی پر	بس اسی زندگی پہ مڑتا ہے
جس کو دنیا نے نافراد کہا	وہی نام کام کام کرتا ہے

اخبار نویس

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ محمد علی اخبار نویس کے لئے بنائے گئے تھے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے انگریزی اور اردو اخبار نویسی میں وہ کامیابی حاصل کی جو ہندوستان میں شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو۔ جس وقت "کامرڈ" نکلا تو کس کو امید تھی کہ تھوڑے ہی دن میں اس نوجوان صحافی کا پرچہ اس قدر مقبول عام ہو جائیگا۔ کہ دائسراے سے لیکر قوم پرست رہنما تک سب اس کی اشاعت کے منتظر رہا کریں گے۔

اس زمانے سے اخبار نویسوں کی طرح محمد علی بھی بے حدزدونوں اور طول پسند واقع ہوئے تھے لیکن ان کا اندازِ بیاں تشادسچپ ہوتا تھا کہ ان کے طویل مضامین کا پڑھنا گراں نہ گزرتا تھا۔ اور مزاحیہ نگاری کی تو گویا انہوں نے ہندوستان میں بنیاد ڈالی تھی۔ گپ کے کالم پڑھنے والوں کو اس پر لندن کے "پنچ" کا دھوکا ہوتا تھا۔

اردو صحافت میں انہوں نے "ہمدرد" نکال کر ایک بیش بہا اضافہ کیا۔ اس وقت تک اردو روزناموں میں سوائے انگریزی اخبار کے غلط تراجم کے کچھ نہ ہوتا تھا۔ اور یہ "ہمدرد" ہی تھا کہ اس نے ایسا اعلیٰ معیارِ صحافت قائم کیا۔ جو اکثر انگریزی اخباروں کو بھی نصیب نہ تھا۔ "کامرڈ" اور "ہمدرد" دونوں میں محمد علی نے چن چن کر قابلِ شریک کار رکھے جنہوں نے محمد علی کی نگرانی میں دونوں اخباروں کو مشہور و ممتاز بنا دیا۔ اگرچہ بعد میں سیاسی مصروفیتوں کی وجہ سے محمد علی صحافت کی طرف زیادہ توجہ نہ کر سکے لیکن پھر بھی "ہمدرد" اور "کامرڈ" نے اپنے زمانے میں اتنی قابلِ قدر خدمات انجام دیں کہ ان کے نام ہندوستانی

صحافت کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

لیکن محمد علی فقط ایک دلیر قومی لیڈر ایک قابل راویب
ایک کچپان داخبار نویس اور ایک عمدہ شاعر ہی نہیں تھے بلکہ

سب خصوصیات سے بڑھکر ان کی بذکہ سنجی تھی۔ وہ ایک کچپ انسان تھے
 وہ بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی اپنی خرافت طبع اور شوخی کو ہاتھ سے نہ جانے
 دیتے تھے۔ حاضر جوابی میں کمال رکھتے تھے۔ حاضر جوابی بھی کیسی؟ پھکڑ اور فضول
 گوئی نہیں بلکہ نہایت مستحضر اور پاکیزہ مذاق۔

اگر محمد علی کی زندگی کے کچپ لطیفے جمع کئے جائیں تو اس سے زیادہ
 ضخامت کی کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ لہذا دو کچپ لطائف پر اکتف
 کی جاتی ہے۔

محمد علی ہمیشہ اسمبلی میں داخلہ کے خلاف رہے لیکن کبھی کبھی بحیثیت
 ”ہمدرد“ کے نمائندے کے پریس گیلری میں چلے جاتے تھے۔ ایک بار وہ اوپر
 بیٹھے تھے کہ نیچے سے ان کے ایک کانگریسی دوست نے مذاق میں کہا ”محمد علی
 جب یہاں تک آگئے ہو تو دو قدم اور اتر کر ہمارے پاس ہی کیوں نہ آ جاؤ؟“
 محمد علی نے فوراً جواب دیا ”جی نہیں میں تو اس بلندی سے آپ کی پستی کا
 نظارہ دیکھ رہا ہوں“

”ہمدرد“ کی ایک سالگرہ کے موقع پر محمد علی نے دہلی کے مشہور شہرپوں
 اور اخبار نویسوں کی ایک پرتکلف دعوت کی۔ ہمانوں کی طرف سے شکریہ
 کی تقریر حکیم اجمل خان مرحوم نے کی اور فرمایا ”خدا کرے ایسی سالگرہ

ہر تیسرے مہینے ہوا کرے، اس پر محمد علی نے برجستہ کہا "ضرور، مگر
 اخبار کا چندہ
 بھی اسی حساب
 سے وصول
 کیا
 جائے گا

— (※) —

(جری عجلتِ قم)

مسدس حالی کا صدی پیش

(مرتبہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی)

مسدس حالی کا سب سے بہتر اور اعلیٰ ایڈیشن، مولانا حالی کی صد سالہ سالگرہ کی یادگار، مقدمات اور تقریبات کے سلسلہ سے مرن جن کو ملک کے مشاہیر اہل قلم نے تحریر فرمایا۔ وہ کتاب جس کو اعلیٰ حضرت شاہ دکن اور اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے شرف ہمایونی بخشا۔ قسم اعلیٰ آرٹ پیپر پر نہایت اعلیٰ چرمی جلد قیمت دو روپے۔ قسم اول ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر جلد ایک روپیہ کتابت اور طباعت بہترین۔

زادراہ!

(از جناب منشی پریم چند صاحب)

اُردو ادب میں بے بہا اور قابل قدر اضافہ، و نیائے افسانہ نگاری کے سب سے بلند پایہ ادیب کے تازہ ترین افسانوں کا مجموعہ اعلیٰ لکھائی اور چھپائی مجلد دیدہ زیب سرورق قیمت صرف ایک روپیہ (علم)

میلنے کا پتہ:- حالی پبلشنگ ہاؤس۔ کتاب گھر دہلی

ہنیا اور دوسرا فسانے

(از جناب مجنوں گورکھپوری صاحب)

اُردو ادب میں ایک قابل قدر ادبیش بہا اضافہ۔ مجنوں گورکھپوری کے
افسانوں کا مجموعہ، بہترین کاغذ عمدہ لکھائی اور چھپائی۔ صفحات ۱۹۲ -
۲۸ پونڈ کے کاغذ پر ۳۰/۱۴ تقطیع

قیمت صرف بارہ آنے (۱۲) تاجران کتب کو معقول کمیشن
ملنے کا پتہ:۔ حالی پبلشنگ ہاؤس "کتاب گھر" دہلی

زیر طبع کتب

مختصر سوانح حیات مسرید اعظم "مادر ہند پوت سیرنہ" کی دوسری کتاب
قیمت صرف چھ آنے (۶)
مسوئینی کی زندگی کے مختصر حالات موجودہ اطالیہ اور حبشہ کی
جنگ کی روشنی میں۔ قیمت صرف چھ آنے (۶)
اُردو کی جلد کتب ملنے کا پتہ:۔ حالی پبلشنگ ہاؤس "کتاب گھر" دہلی

اقبالؔ : یہ کتاب بہت اچھی ہے یہ ایک دوسرے
 سے بہتر ہے۔ اس کے کئی ماحیوں کہ اس کتاب کو ضرور
 پڑھو۔ اچھی کتابیں ضرور پڑھنا چاہیے اس سے
 کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہو گا ہے اچھا اور حافظہ
 بڑھتا ہے۔

مطبوعہ جامعہ پریس دہلی

LIBRARY
This book was taken from the Library on the
date last stamped. A fine of 1 anna will be
charged for each day the book is kept over
time. 2919

01	TIRUPATI STACKS 21.1.9
One	44.42 / 44.42
Date	3 JAN 68